حقائقِ عالیہ

پروفیسر ڈاکٹر
علامہ نصیر الدین نصیر ہونزائی

حقائقِ عالیہ

Institute for
Spiritual Wisdom
and
Luminous Science
Knowledge for a united humanity

پروفیسر ڈاکٹر
علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی
ڈاکٹر آف لیٹرز (آنزیری) ڈسٹنگوشڈ سینیئر پروفیسر
سینیئر یونیورسٹی کینیڈا۔ یو۔ ایس۔ اے

شائع کردہ:
دانشگاہِ خانۂ حکمت
ادارۂ عارف
3 اے نورویلا۔ گارڈن ویسٹ کراچی 3 پاکستان

ISW LS

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science

Knowledge for a united humanity

فہرستِ عنوانات

شمار	عنوان	تاریخ	صفحہ
۱	دیباچۂ طبع ثانی	۴، جون ۱۹۹۹ء	۵
۲	پیش لفظ	۵، جنوری ۱۹۸۷ء	۱۰
۳	گلہائے معنوی	۲۷، نومبر ۱۹۸۶ء	۲۱
۴	عالمِ لامکان	۲، دسمبر ۱۹۸۶ء	۳۱
۵	روح اور مادہ	۶، دسمبر ۱۹۸۶ء	۳۹
۶	چہرۂ خدا کی روشنی میں	۱۱، دسمبر ۱۹۸۶ء	۴۷
۷	حجاب اور مظہر	۱۵، دسمبر ۱۹۸۶ء	۶۰
۸	اسرارِ انبیاء و أئمہ	۱۸، دسمبر ۱۹۸۶ء	۶۹
۹	قرآنی علم الاعداد I	۲۱، دسمبر ۱۹۸۶ء	۷۷
۱۰	قرآنی علم الاعداد II	۲۴، دسمبر ۱۹۸۶ء	۸۵
۱۱	رجوع الی اللہ	۲۸، دسمبر ۱۹۸۶ء	۹۳

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

دیباچۂ طبعِ ثانی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَللّٰھُمَّ اجعل لی نورًا فی قلبی، ونورًا فی سمعی، ونورًا فی بصری، ونورًا فی لسانی، ونورًا فی شعری، ونورًا فی بشری، ونورًا فی لحمی، ونورًا فی دمی، ونورًا فی عظامی، ونورًا فی عصبی، ونورًا من بین یدیّ، ونورًا من خلفی، ونورًا عن یمینی، ونورًا عن یساری، ونورًا من فوقی، ونورًا من تحتی، اَللّٰھُمَّ عظّم لی نورًا وّ نعمةً وّ سرورًا (دعائم الاسلام، جلد اوّل، ص ۱۶۷)۔

حکمتِ اوّل: آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی یہ بابرکت دعا ایک خزانۂ اسرار ہے، بلکہ یہ ایک جہانِ علم وحکمت ہے جو انتہائی جامع الفاظ میں سمیٹا ہوا ہے، یہ چوٹی کی دعا بھی ہے چوٹی کی تعلیم بھی ہے، نور کی کارکردگی کی معرفت بھی ہے، رحمتِ الٰہی کی امکانیت بھی ہے، اور حقیقتِ حال کی تصویر کشی بھی ہے کہ نور کس طرح پیغمبرؐ اور امامؑ میں محیط ہو کر کام کرتا ہے۔

حکمت دوم: نور میں انوار ہُوا کرتے ہیں، جیسے نورِ ھدایت، نورِ علم، نورِ ایمان، نورِ یقین، نورِ عشق، نورِ عقل، نورِ معرفت وغیرہ، اور اسی طرح بہت سے انوار کا مجموعہ نور کہلاتا ہے، جیسے مذکورۂ بالا دعائے نور میں الگ الگ انوار کا ذکر ہے، اور وہ سب مل کر ایک نور بھی ہے، جس کی دلیل قرآنِ پاک میں نورٌ علیٰ نور ہے۔

حکمتِ سوم: نور آنکھ بھی ہے، آنکھ کی روشنی بھی، دُوربین بھی ہے، خردبین بھی، خودبین (خود شناس) بھی ہے، اور خدابین بھی، جب نور عارف کے دل میں آتا ہے تو وہ خالی خولی نہیں آتا، بلکہ مکان ولامکان کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔

حکمتِ چہارم: دل کے مراکز تین مقام پر ہیں: سینہ، جان، اور عقل، اس سے یہ راز بھی معلوم ہُوا کہ اس پاک دعا میں جو نور مطلوب ہے، وہ نہ صرف جسمانی بہتری کے لئے ہے، بلکہ نور کی زیادہ سے زیادہ ضرورت روح اور عقل کے لئے ہے تاکہ منشائے الٰہی کے مطابق انسان کنزِ مخفی کو حاصل کر سکے۔

حکمتِ پنجم: میں سمجھتا ہوں کہ اس دعا میں روحانی طِبّ بھی ہے اور روحانی سائنس بھی، طِبّ اس معنیٰ میں ہے کہ جب بال، کھال، گوشت، خون وغیرہ میں نور موجود ہو گا، تو پورے بدن میں کوئی بھی خطرناک بیماری نہ ہوگی، اور اس بھرپور نورانیت

میں روحانی سائنس کیوں نہ ہو، نور کی روشنی میں بے شمار غیر معمولی چیزوں کا بار بار مشاہدہ اور کامل تجربہ ہوتا ہوگا۔

حکمتِ ششم: حضرتِ محمّد مصطفیٰ رسولِ خداؐ سراجِ مُنیر اور نورِ مُنزّل تھے، آپؐ کی مُبارک ہستی کا ذرّہ ذرّہ پُر نور ہُوا تھا، اور اس ہمہ گیر طوفانی روشنی کا آغاز غارِ حرا ہی سے ہُوا تھا، پھر دعائے نور کا مطلب آنحضرتؐ کے نزدیک سوائے تعلیم اور دعوت کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

حکمتِ ہفتم: آپ نے نبیؐ اور ولیؑ (امام) کے جُثّۂ ابداعیہ کے بارے میں سُنّا ہوگا، وہ سراپا نور ہی نور ہوتا ہے، یہ خلقِ جدید ہے، اس میں ہمیشہ ہمیشہ جدّت اور تازگی قائم رہتی ہے، یہ نور ہے اور فرشتہ، لہٰذا اس کا عکس انسانِ کامل میں بھی ہو سکتا ہے۔

حقائقِ عالیہ: یہ کتاب اس لئے بھی بہت ہی پیاری ہے کہ اس کی تصنیف لنڈن میں ہوئی تھی، جہاں میری نمائندہ روحیں اور کائناتیں ہیں، اور کہاں نہیں ہیں؟ لوگ کہتے ہیں کہ ایک شخص کی ایک ہی جان ہُوا کرتی ہے، میں کہتا ہوں کہ نہیں نہیں، ایسا نہ کہا کرو، یہ بہت بڑی ناشکری ہے جبکہ تم میں سے ہر فرد ایک عالمِ شخصی ہے، جس میں بے شمار جانیں یا روحیں ہیں، جہالت کی وجہ سے بہت سے لوگ علم و معرفت کی

بہشت کی لذّتوں اور خوشیوں سے محروم ہو گئے ہیں۔

حقائقِ عالیہ واقعاً بڑی عمدہ کتاب ہے، آپ حقیقی معنوں میں اسے پڑھ کر دیکھیں، اس کے عنوانات اب گیارہ ہو گئے ہیں۔ میں نے کبھی غلطی سے یہ خیال بھی کیا ہو گا کہ میں کوئی چیز ہوں، حالانکہ میں ناچیز ہوں، کیونکہ میں جب اپنے ماضی کی طرف جانے لگتا ہوں تو قدم قدم پر خود کو کم سے کمتر دیکھتا جاتا ہوں، تا آنکہ میرا کوئی نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

انتسابِ جدید: اگرچہ جہادِ اکبر کی بہت بڑی اہمیت ہے اور بہت بڑی تعریف بھی ہے، لیکن جب تک اس کے نتیجے میں گنجِ علم اور پھر جنگِ علم میں فتح حاصل نہ ہو تو پھر جہادِ اکبر کا اصل مقصد حاصل نہ ہُوا، الحمد للہ، جب بعض نیک بخت مومنین و مومنات کو یہ معلوم ہُوا کہ یہاں آلِ محمدؐ کے امامؑ نے ایک علمی چراغ کو روشن کر دیا ہے، تو یہ سب پروانہ وار عشق کے ساتھ اس روشنی کے گرداگرد جمع ہو گئے، تاکہ جذبۂ پروانہ اور عقلِ انسانی کے مطابق نورِ علم کی خدمت کریں، پس شمعِ محفلِ علم و حکمت کے پروانوں میں سے ایک پروانۂ جان باز محترمہ کریمہ ناتھانی بھی ہیں، ان کے دل میں ہمیشہ علم کے لئے تڑپ اور بے چینی جاری رہتی ہے، یہ ان خوش نصیب افراد میں سے ہیں جو علم و حکمت کی باتوں سے زبردست اثر لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ محترمہ کریمہ ناتھانی علمی خدمت

کو اپنی جانِ شیرین سے بھی زیادہ شیرین سمجھتی ہیں۔

آپ کے والدِ محترم کا اسمِ گرامی غلام علی حبیب ناتھانی ہے جو ۲۰ ستمبر ۱۹۳۰ کو گجرات (انڈیا) کے گاؤں پور بندر میں پیدا ہوئے، آپ نے ۱۹۵۷ تا ۱۹۶۰ گارڈن لائبریری میں آنریری خدمات انجام دیں، ۱۲ دسمبر ۱۹۹۸ کو آپ کا انتقال ہُوا۔

کریمہ کی والدۂ محترمہ کا نام مسز کلثوم غلام علی ناتھانی ہے، آپ ۲ دسمبر ۱۹۳۵ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں، دین و مذہب اور علم سے بے انتہا دلچسپی ہے، آپ گارڈن جماعت خانہ میں آبِ شفا کے برتنوں کی صفائی اور ان کی تنظیم کی کمیٹی میں ایک عرصے سے خدمت کر رہی ہیں۔

نصیر الدّین نصیرؔ (حُبِّ علی)، ہونزائی

جمعہ ۱۹ صفر المظفر ۱۴۲۰ھ ۴ جون ۱۹۹۹ء

پیش لفظ

۱۔ بِسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم۔ یاربّ العزّت! تُو اپنی رحمتِ بیکراں سے اس بندۂ عاجز و کمترین کو ایسی توفیق و ہمت عنایت فرما، کہ وہ براستۂ لطف و کرم اِس خاکسارِ ہیچ مداں کی دستگیری و رہنمائی کرے، اور ایک انتہائی دلپذیر روش سے قدم بقدم اور منزل بمنزل آگے سے آگے لیجا کر تیرے محبوب پیغمبر حضرت محمّد مصطفیٰ صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم، اور ائمّۂ آلِ پاکِ محمّدؐ کے دریائے عشق و معرفت میں سراپا ڈبو دے، تاکہ اُس بحرِ عجائب و غرائب میں، جو آبِ رحمت بھی ہے، اور آب و تاب بھی، یہ دلِ سخت و سنگین مسکۂ مُلائم کی طرح بآسانی پگھل جائے، اور اُس حال میں اشک فشانی کے ساتھ تیری ہر ہر نعمتِ عظمیٰ کی پُرخلوص اور عاجزانہ شکر گزاری ہو، بیشک اس نیک عمل سے ایک گونہ تسکینِ خاطر اور راحتِ جان ضرور ہو گی، لیکن اے میرے بیحد مہربان پروردگار! تیرے احسانات و انعامات ایسے عظیم اور اِتنے کثیر ہیں کہ اس دل خواہ سعی کے باوجود تیرے حقوقِ سپاس کی کائنات کا ایک ذرّہ بھی ادا نہیں

ہو سکتا۔

۲۔ اے خدائے بزرگ و برتر! اے ملیکِ مُقتدِر (۵۴/۵۵) اے بادشاہِ بندہ نواز! تیرے نورِ اقدس کے عاشقانِ صادق سے میری مسکین رُوح فدا ہو! اگرچہ میں صرف ایک مُٹھی خاک ہُوں، اور تُو شاہنشاہِ افلاک ہے اور بہت ہی پاک، پھر بھی اِس خاکِ پائے مومنان پر تیری نگاہِ جود و احسان ہے، کہ تُو نے اپنے اَولیائے کرام (أئمۂ طاہرین علیہم السّلام) کی دوستی سے سرفراز فرمایا، اور انہی حضرات کے نورِ ولایت کی روشنی میں خزائنِ قرآن مِل سکتے ہیں، الحمد للہ۔

۳۔ اما بعد گزارش یہ ہے کہ ۱۹۸۶ء کو بارِ دُوم سفرِ چین کی سعادت نصیب ہُوئی، ہر چند کہ یہ دَورہ محدود اور مختصر تھا۔ لیکن بفضلِ خداوندِ تعالیٰ اس میں توقع سے بہت ہی زیادہ کامیابی اور بیحد شادمانی ہُوئی، چنانچہ سب سے پہلے جو قابلِ تعریف چیز مُشاہدے میں آئی، وہ چین کی موجودہ ترقی ہے، یارقند میرے لئے بڑا بابرکت شہر ہے، کیونکہ یہ سچ اور حقیقت ہے کہ اِس خاکِ پائے مومنان نے وہاں صرف چند کرامات نہیں بلکہ نورِ اسلام کے بھرپور معجزات کی ایک کائنات دیکھی ہے، آپ قرآنِ حکیم میں مادّہ: ل۔ ت۔ م کے تحت دیکھ لیں کہ آیا علم وحکمت کی زبان میں ان معجزات کی طرف اشارہ نہیں کرنا چاہیئے؟ کیا حق اور شہادت کو چھُپا لینا چاہیئے؟ (۲/۱۴۰، ۲/۴۲، ۲/۲۸۳) ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔

۴۔ دورۂ یارقند کے بعد اِس خاکسار خادم کو لنڈن کے عزیزوں سے ملنے کا لائحہ طے ہوا تھا، وہ چراغِ امامت کے پروانے نورِ معرفت کی روشنی میں ایک بڑی تابناک اور کامیاب مذہبی اور علمی زندگی گزار رہے ہیں، ان کو اعلیٰ سطح پر یہ زرّین موقع میسّر ہے کہ دینِ اسلام اور اسماعیلیت کی قلمی اور علمی خدمت کریں، وہ ایک ایسے مُلک میں رہتے ہیں، جہاں ظاہری علوم اور مادّی ترقیوں کا طوفان چل رہا ہے، اور نتیجے کے طور پر بہت سے سوالات پیدا ہو سکتے ہیں، جن پر وہ وقتاً فوقتاً مل کر روشنی ڈالتے ہیں، اور کبھی کبھار اس بندۂ درویش کو بھی اس علمی محفل میں شرکت کیلئے دعوت دیتے ہیں۔

۵۔ یہ تو سب کو معلوم ہی ہے کہ جہاں علم کی سطح زیادہ سے زیادہ بلند ہو، وہاں حقیقی علم کا ظہور قدرتی طور پر اسی معیار کے مطابق ہو جاتا ہے۔ اس علم کی ایک دُوسری شرط عاجزی اور کثرتِ ذکر و بندگی ہے، اگر آپ چاہیں تو جذبۂ علم سے سرشار اور ہمہ تن گوش ہو کر جلوہ ہائے علم کے لئے مقناطیسیت پیدا کر سکتے ہیں، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم بندے روحانی اور علمی بھوک اور پیاس کے مارے گریہ و زاری اور فریاد و فغان کرتے رہیں، اور خدا تعالیٰ کو اس دردناک حالت کی خبر ہی نہ ہو، حالانکہ قرآنِ کریم بار بار فرماتا ہے کہ؛ خدا تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے (۱۱/۱۲۳)

۶۔ الغرض اگر یہ مانا جائے کہ یہ خادم ایک ٹیچر (استاد) ہے، تو لازمی طور پر یہ مثال بھی بالکل درست ہو جاتی ہے کہ ہر مُعلّم ایک شِیر دار

خاتون کی طرح ہے، اور اس کی ذاتی معلومات علمی دودھ کہلاتی ہیں، مگر اس میں ایک بڑا فرق بھی ہے، وہ یہ کہ ظاہری عورت اور مادہ جانور کا دودھ محدود مقدار میں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مقرّرہ وقت کے لئے ہوا کرتا ہے، لیکن علم کا دودھ غیر محدود بھی ہے اور دائمی بھی، چنانچہ مثال کے طور پر اگر آپ کسی قابل ٹیچر کو گھر میں محبوس کر دیتے ہیں، تو اس غریب خاتونِ علم کا قیمتی دودھ ہمیشہ کے لئے سُوکھ جائیگا، دریں صورت اس کا انفرادی اور قوم کا اجتماعی نقصان ہو سکتا ہے۔

۷۔ الحمد للہ، میرے نہایت ہی مہربان امامِ زمان صلوات اللہ علیہ وسلامہ، کی پاک نورانی دعا اور زبردست تائید سے میرے مشرق و مغرب کے بہت سے دوستوں، عزیزوں، اور شاگردوں نے اِس شِیرِ شِیرین کو نہ صرف جاری ہی رہنے دیا، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اِس میں اضافے اور ترقی کے لئے بھی مواقع فراہم کر دیئے، جیسے ادارے کی شکل میں مل کر کام کرنا، جس میں تصنیف، ترجمہ، درس و تدریس، اور لیکچرز کا اہتمام، مفید علمی سوالات، دَورہ کے فرائض، جماعت اور اداروں کی خاموش خدمت، وغیرہ وغیرہ شامل ہیں، پس اس علمی خدمت کا سارا ثواب میرے عزیزوں کو حاصل ہے، اور اس سے مجھے بیحد خوشی ہے۔

۸۔ امامِ اقدس و اطہر علیہ السلام کی نورانی دعا کس طرح کام کرتی ہے، اس کے بارے میں ایک مستقل مضمون ہونا چاہیئے، کیونکہ ہر مومن کی کامیابی اسی

مبارک دعا کی برکتوں سے حاصل ہوتی ہے، چنانچہ لنڈن جیسے عظیم اور انتہائی حسین وجمیل شہر کے کسی پاکیزہ مکان میں تنہائی، ریاضت، عبادت اور مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات کی سعادت نصیب ہوئی، اس کے علاوہ ہم نے اپنے فرشتہ خصلت عزیزوں کے ساتھ بھی بارہا آنسوؤں کے تابناک موتی برساتے ہوئے مناجات ودعا کی، جس سے سکونِ قلب حاصل ہُوا، اور یہ رُوح پرور سِلسِلہ تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا، اسی اعتکاف جیسی مدّت میں یہ عزیز رسالہ جو "حقائقِ عالیہ" کے اسم سے موسوم ہے مرقوم ہُوا، اور کتاب کا یہ نام ہمارے عظیم دوستوں کی تجویز سے مقرر ہُوا۔

۹۔ قرآنی حکمت کا فرمانا یہ ہے کہ ہر چیز میں علم ہے، یعنی ہر مثال میں علم ہی کا ذکر موجود ہے (۶/۸۰ ، ۴۰/۷) پس وہ صلوٰۃ جو اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اہلِ ایمان پر بھیجتے ہیں علم کی ایک صورت ہے، تاکہ اُن کو ظُلمتِ جہالت سے نکال کر نورِ معرفت کی طرف لائیں (۳۳/۴۳) اور وہ صلوٰۃ بھی علم ہی کی ایک کیفیّت ہے، جو رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی جانب سے مومنین کو حاصل ہوتی تھی (۹/۱۰۳) اور اب یہی علم امامِ وقت علیہ السّلام سے مِل سکتا ہے، کیونکہ اسی مقصد کے لئے خدا ورسولؐ نے امامؑ کو مقرّر فرمایا ہے (۵۷/۲۸)

۱۰۔ خداوندِ تبارک وتعالیٰ نے امامؑ کی تعریف وتوصیف چار مقامات پر فرمائی ہے، وہ لاہوت، جبروت، ملکوت، اور ناسوت ہیں،

عالمِ ناسوت میں امامِ عالی مقام کی جو معرفت ہے، اس کے تین درجے ہیں۔ یعنی امام کی تعریف پیغمبروں کے ساتھ بھی ہے، ان کے بعد بھی، اور مومنین کے ساتھ بھی، سوال: نورِ نبوّت اور نورِ امامت کے ایک ہی مقام پر ہونے کی مثال و دلیل کیا ہے؟ جواب: الف: دیکھئے اُس خلافتِ الٰہیہ کے اعلانِ اوّل کو، جسمیں نبوّت و امامت دونوں مقصودِ خدا ہیں ($\frac{۲}{۳۰}$)۔ ب: حضرت ابراہیم علیہ السلام پیغمبر بھی تھے اور امام بھی، جس سے نبوّت و امامت کی یکجائی کا ثبوت مل جاتا ہے ($\frac{۲}{۱۲۴}$)۔ ج: حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ علیہما السلام دونوں پر وحی نازل ہوتی تھی، ان میں سے پہلی وحی جلی ہے، اور دوسری وحیٔ خفی، اور سب جانتے ہیں کہ حضرت ہارونؑ امام تھے ($\frac{۲}{۲۴۸}$، $\frac{۲۱}{۴۸}$)

۱۱۔ سوال: پیغمبر کے بعد امام کا ہونا کیوں ضروری ہے؟ اور اس کا کیا ثبوت ہے؟ جواب: الف: ہر پیغمبر کا ایک وزیر اور جانشین ہُوا کرتا ہے، تاکہ لوگوں کو آسمانی کتاب کی حکمت سے آگاہ کر دیا جائے ($\frac{۲۵}{۳۵}$، $\frac{۷}{۱۴۲}$) ب: ہر آسمانی کتاب کا ایک خاص وارث ہوتا ہے، اور وہ امام ہی ہے۔ ($\frac{۳۵}{۳۲}$) ج: رسولؐ کے بعد اولوالامر کا سلسلہ جاری ہے ($\frac{۴}{۵۹}$)۔ د: کتابِ سماوی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے نورِ منزل کا ہونا بھی ازبس ضروری ہے ($\frac{۵}{۱۵}$)۔

۱۲۔ سوال: جو امام انبیا علیہم السلام کے ساتھ ہو، اور ان کے بعد

بھی ہو، وہ مومنین کی قطار میں کیسے آسکتا ہے؟ جواب: الف، حضرت امام علیہ السّلام صاحبِ امر (ولیٔ امر) یعنی امیرِ مومنان ہیں (۴/۵۹) لٰہذا ظاہراً و باطناً اہلِ ایمان کی صفِ اوّل میں بلکہ اس سے بھی آگے اُن کا ہونا لازمی ہے تاکہ اُمّت پیغمبرؐ کے بعد امامِ وقت کی پیروی کرسکے۔ ب: قرآنِ حکیم میں جہاں جہاں خداوندِ عالم نے ہر زمانے کے مومنین سے خطاب فرمایا ہے، جیسے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو!) وہاں امامِ عالی مقامؑ بحیثیتِ امیر المومنین پیش پیش ہیں۔ ج: سورۂ حدید میں ارشاد ہے (ترجمہ) "جس دن آپ مومنین و مومنات کو دیکھیں گے کہ اُن کا نور اُن کے آگے اور داہنی طرف دوڑتا ہوگا"۔ یہ حکم حضراتِ ائمّہ، مومنین، اور مومنات میں مشترک ہے، یعنی اِس نورانی تعلیم میں اہلِ ایمان کے مردوں اور عورتوں کے ساتھ امام بھی ہے جس کی وجہ سے اہلِ نجات کا یہ مرتبۂ نورِ عقل باعثِ صد افتخار نظر آتا ہے، امامِ اقدس و اطہرؑ کی جو معرفت ناسوت میں ہے، وہ بُنیادی ہونے کے سبب سے بیحد ضروری ہے، اور جو تعریف و توصیف ملکوت، جبروت، اور لاہوت میں کی گئی ہے، وہ بعد کی چیز ہے، اور وہ اسی کی تابع ہے، نیز اِس پیش لفظ میں اس کی تفصیلات کیلئے گنجائش بھی نہیں۔

۱۳۔ اِس خادم کی تحریریں اکثر اِن موضوعات سے متعلق ہیں، قرآنِ حکیم، اسلام، توحید (خداشناسی) نبوّت (پیغمبر شناسی) امامت (امام شناسی) آسمانی محبّت، یعنی خدا، رسولؐ اور امامؑ کی محبّت، طریقۂ اسماعیلیّت، تقویٰ

ذکر و عبادت اور گریہ وزاری، اِطاعت و فرمانبرداری، نور اور نورانیت، روح اور روحانیّت، تصوّف، حکمت، باطنیّت، خدا کی ہر چیز زندہ ہے، سُنّتِ الٰہی، مطالعۂ قدرت، علمِ حدود (حدودِ دین) علمِ الاشارات، علم الاعداد، علم التّاویلات، علم الاسرار، علم النّقوش (ڈایاگرامز) اسرارِ انبیاء و ائمہ، یک حقیقت (MONOREALITY) عالمِ خیال، عالمِ خواب، عالمِ ذرّ، عالمِ شخصی (عالمِ صغیر) حکمت تثنیہ (دو کی حکمت) انائے عُلوی اور انائے سُفلی، قیامت، ابداع و انبعاث، تخلیق در تخلیق، ازل و ابد، لامکان اور دہر، انسان اور انسانیت، وحدتِ انسانی، اڑن طشتریاں (FLYING SAUCERS) جسمِ لطیف، روحانی مشقیں، قصۂ معجزات، روحانی خوشبوئیں، روحانی سائنس، مذہب اور سائنس، قرآنی اور علمی علاج، زندہ بہشت، سوال و جواب، روح اور مادّہ، دائرۂ دائمیّت، لاابتدا اور لاانتہا، وغیرہ وغیرہ۔

۱۴۔ مذکورۂ بالا مضامین میں سے بعض منظّم اور یکجا ہیں، بعض ایسے نہیں، بلکہ ان کے اجزاء دوسرے موضوعات میں بکھرے ہوئے ہیں، جیسے قصۂ معجزات، جو یکجا مضمون نہیں، مگر جگہ جگہ کثرت سے، نہ صرف اشارات میں بلکہ واضح الفاظ میں بھی، ان کا ذکر کیا گیا ہے، لہٰذا قارئین کیلئے معلومات فراہم کرنے کی غرض سے موضوعات کی یہ فہرست یہاں درج کی گئی۔

۱۵۔ جیسا کہ ہر ادارے کا یہی اصول رہا ہے کہ ہر پروگرام اور ہر کام افسرِ اعلیٰ یعنی پریذیڈنٹ کی تجویز یا حکم، یا منظوری اور نگرانی کے بغیر انجام نہیں

پاسکتا، تاہم حق بات تو یہ ہے کہ ہمارے دونوں پریذیڈنز صاحبان اِس رسمی صفت سے بڑھ کر کارہائے نمایاں انجام دیتے آئے ہیں، ان کو خشک بزرگی بالکل پسند ہی نہیں، یہ آج کے مشرق و مغرب کے ترقّی یافتہ انسانوں کی طرح زبردست سوشل ورکر ہیں، بلکہ یہ علمی مجاہدین کے سردار ہیں، اور خدا کے علم میں یہ بات روشن ہے کہ میں جان و دل سے ان کے ہزاروں احسانات و خدمات کا اعتراف کر رہا ہوں، یعنی جناب فتح علی حبیب صدرِ خانۂ حکمت اور جناب مُحمّد عبدالعزیز صدرِ ادارۂ عارف کا بیحد شکرگزار ہوں کہ ان امامِ عالیمقامؑ کے عاشقوں نے اپنے شرق و غرب کے تمام ساتھیوں کی بھرپور مدد سے میری محدود علمی خدمت کو غیر محدود اور لازوال بنا کر عالمِ اسلام اور اسماعیلیت میں پھیلادیا، نیز محترمہ ایڈوائزر گُل شکر فتح علی، اور محترمہ سیکریٹری یاسمین محمّد کا بھی از حد ممنون ہوں کہ ان چار جسمانی فرشتوں نے دوسرے عملداروں اور ممبروں کے تعاون سے جیسے انتہائی مفید علمی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ انکی کہیں مثال نہیں ملتی، ان کے اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ کمال بیان کرنے کے لئے کئی مہینوں کا عرصہ بھی کم ہے، مختصر یہ کہ ان مشکل اور پیچیدہ حالات میں اِس مشکل ترین کام (یعنی علمی خدمت) کو انجام دینے کے لئے نگاہِ خداوندی نے دُنیا بھر کے لوگوں سے ان کو اور ان کے مشرق و مغرب کے ہمکاروں (COLLEAGUES) کو منتخب فرمایا ہے، ساتھ ہی ساتھ اِن سب کو عالی ہمتی اور اُولُوالعزمی بھی عطا ہوئی ہے۔

۱۶۔ ہمارے عزیزان جو امامِ اقدس و اطہرؑ کے نورانی علم کی برکت سے ذرّاتِ رُوح کے بھیدوں سے خوب واقف و آگاہ ہیں، چنانچہ وہ اِس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ ہم سب ذرّاتی طور پر اپنے ہر فرد میں موجود ہیں، لہٰذا کسی ایک کی تعریف درحقیقت سب کی تعریف ہے، تاہم اس کے باوجود یہاں یہ مناسب ہے کہ ادارۂ عارف کی برانچ لنڈن کے چیئرمین امین کوٹاڈیا اور سیکریٹری مریم کوٹاڈیا کا بطورِ خاص شکریہ ادا کریں، کہ رسالۂ "حقائقِ عالیہ" میں جو موتیوں کا خزانہ ہے، وہ اُس ابرِ رحمت کی دُرّ فشانی سے جمع ہوا ہے، جو عشقِ مولا کے سمندر سے اُٹھ اُٹھ کر سرِ عزیزان کی فضاؤں میں چھائے ہوئے برستا رہتا تھا، سُبحان اللہ! شاہِ ولایت کی نورانی کرامت دیکھئے کہ پورے لنڈن میں موسمِ سرما زور آزمائی کر رہا ہے، لیکن اِس کا ایک گوشہ ایسا ہے کہ اس میں چند درویشوں کی قلبی شادابی کی خاطر بہارِ روح پرور کی بارش برس رہی ہے۔

۱۷۔ آخر میں ہم سب عارف کی برانچ امریکا کے چیئرمین نورالدّین راجن پاری کی علم دوستی اور گرانقدر خدمات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں، اِسی طرح کوآرڈینیٹر ماہِ محل بدرالدّین، اور کوآرڈینیٹر یاسمین نورعلی کے بھی قلبی طور پر شکرگزار ہیں کہ یہ عزیزان اپنے مولائے برحقؑ کے حقیقی علم کی روشنی دُور دُور تک پھیلانے کے لئے بلند و بالا اور مستحکم منارے (LIGHT - HOUSES) ہیں، خداوندِ عالم سب مومنین کو دوجہان۔

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

سلامتی اور کامیابی عنایت فرمائے ! آمین !!

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

پیر ۴ جمادی الاوّل ۱۴۰۷ھ ۵ جنوری ۱۹۸۷ء

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

گلہائے معنوی

۱۔ ہمارے دونوں فرشتہ خصلت پریذیڈنٹ فتح علی حبیب اور محمد عبدالعزیز جو احسانات و انعاماتِ خداوندی میں سے ہونے کی وجہ سے ہمیں بیحد عزیز و محترم ہیں، اور ہمارے دوسرے تمام عملدار و ارکان جو انہی معنوں میں بہت ہی پیارے ہیں، ان سب کو اور شمالی علاقہ جات کے تمام دوستوں کو دل کی گہرائیوں سے یاد کرتے ہوئے یا علیؑ مَدد کی مقدس دعا کرتا ہوں، پروردگار اسے قبول فرمائے!

۲۔ خداوندِ قدوس کے فضل و کرم اور آپ جملہ عزیزان کی پُر خلوص اور بامعرفت دُعا سے یہ بندۂ درویش ۲۴ نومبر ۱۹۸۶ء کی شام کے چھ بجے تقریباً ۱۸ گھنٹے کے بعد لنڈن ائرپورٹ پر وارِد ہوگیا، ہر چند کہ سفرِ ہذا خاصا طویل تھا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ کوئی تکلیف نہیں ہوئی، اس مسکین کے استقبال کے لئے یہ عزیزان آئے تھے: ڈاکٹر فقیر محمد صاحب ہونزائی، ان کی بیگم محترمہ رشیدہ، صدر امین کوٹاڈیا، ان کی بیگم محترمہ

مریم، ان کے عزیز فرزند سلمان کریم، عزیزم عبدالرّحمان، اور محترمہ گلشن، یہ حضرات مغرب کے سارے شاگردوں کی نمائندگی کر رہے تھے، انہوں نے توفیقِ خداوندی کے بے آواز اشاروں سے ایک انتہائی پُرحکمت تحفے کو پیش کیا، یہ تھا گلِ یاسمین کا ایک حسین و جمیل گلدستہ، جو ایک خوبصورت کاغذ کے قیف نُما غِلاف میں محفوظ تھا، تاکہ یاسمین کی خوشبو سے بھری ہوئی نرم و نازک اور صاف شفاف پنکھڑیاں تر و تازہ رہیں، میں نے شاید زندگی میں پہلی بار یاسمین کے پھول کو اسی حالت میں تازہ بتازہ نَو بنَو دیکھا۔

۳۔ اگر چشمِ بصیرت سے کام لیا جائے تو اس کائنات کی چیزوں کے باہمی ربط و ضبط اور نظامِ وحدت کو دیکھ کر بہت تعجّب ہونے لگے گا اور ایسا کیوں نہ ہو، جبکہ دستِ قدرت بار بار آسمانوں اور زمین کو تمام اشیائ سمیت لپیٹتا اور سمیٹتا رہتا ہے، اور خدا کے اِس فعل میں اتنی کثیر حکمتیں ہیں کہ ان کو جنّ و مَلَک اور بشر شمار ہی نہیں کر سکتے، چنانچہ میرا یہ یقین ہے کہ مہکتے ہوئے کھلے یاسمین کی صورت میں یہ بندۂ عاجز شرق و غرب کی بہت سی پاک و پاکیزہ روحوں کو سونگھ کر دل و دماغ کو مُعطّر بنا رہا تھا، یہ ایک بہت ہی ضروری سوال ہے، جس کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے، کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم خوشبو کو مادّی چیزوں میں اتنی زیادہ اہمیّت کیوں دیتے تھے؟ ہمارا ایمان یہ کہتا ہے کہ اس میں کئی عظیم حکمتیں

پوشیدہ ہوں گی، اور ان میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ جب روحِ مقدس کے ظہورات ہوتے ہیں، تو اُن میں سے ایک ظہور مختلف خوشبوؤں کی شکل میں ہوتا ہے، ایسی خوشبوئیں جسمِ لطیف ہیں، لہٰذا وہ جسم بھی ہیں اور روح بھی، تاکہ جسم و جان دونوں کے لئے باعثِ مسرت و شادمانی اور وسیلۂ قوت ثابت ہو جائیں۔

۴۔ ہم قرآنِ حکیم کی ہر آیتِ کریمہ کو ایک کلّیہ تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ پیراہنِ یوسفؑ میں پیغمبر اور امام صلوات اللہ علیہم کے جسمِ لطیف کا تذکرہ فرمایا گیا ہے، جس میں بہشت کی گوناگون خوشبوئیں ہوا کرتی ہیں، پس آنحضرتؐ کی سُنّتِ مطہرہ میں خوشبو کی اہمیت کا مقصد یہی ہے کہ ہر ہوشمند روح اور ریحِ یوسفؑ (۱۲/۹۴) کی حقیقت کو پہچان لے۔

۵۔ اِس عالمِ رنگ و بو میں بظاہر خوبصورت دکھائی دینے والے پھول تو بہت ہیں، لیکن برتری اُن پھولوں کی ہے جو رنگینی کے علاوہ عطریات کے خزانے بھی رکھتے ہیں، پس لوگ ایسے پھولوں کے دلدادہ ہوا کرتے ہیں، مگر وجہ ظاہر نہیں کہ کیوں؟ کس لئے؟ اور اس کا پس منظر کیا ہے؟ تاہم اہلِ دانش جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے، وہ جانتے ہیں کہ انسان جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے وہ ایک کامل و مکمل فطرت ہے، جس کی بزبانِ حکمت تعریف و توصیف فرمائی گئی ہے (۳۰/۳۰) یہ فطرت وہ سرشت ہے جو بہشت کی پاک مٹی سے گوندھی گئی ہے، اور جنت کی زمین سے پھولوں کا براہِ راست

رشتہ تھا، جس کی یاداشت انسانی فطرت میں دفنائی ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ آدمی پھولوں سے محبت تو کرتا رہتا ہے، لیکن وہ اس کا سبب بیان نہیں کر سکتا۔

۶۔ دوسری مثال یہ ہے کہ جس طرح لوگ بصورتِ ذرّاتِ روحانی کشتیٔ نوحؑ میں سوار تھے (۱۷/۳ ، ۳۶/۴۱) اسی طرح وہ پشتِ آدمؑ سے وابستہ ہو کر باغِ بہشت میں بھی رہ چکے ہیں (۷/۱۱ ، ۷/۱۸۹) مگر یہ عظیم الشّان واقعہ ان کو یاد نہیں، جیسے واقعۂ "الست" آج کسی کو یاد نہیں، مگر قرآنِ حکیم یاد دلاتا ہے، کیونکہ انسان سے عالمِ ذرّ کی طویل زندگی سراسر فراموش ہو چکی ہے، تاہم اس کی فطرت میں اُس عالم کی نعمتوں سے ایک خاموش اور پوشیدہ مانوسیت باقی ہے، جس کی بنا پر یہ اُن چیزوں کو چاہتا ہے، لیکن وہ اس کی توجیہہ نہیں کر سکتا۔

۷۔ علم کا وہ حصّہ آسان ہے، جو عملی اور تاریخی نوعیت کا ہو، یعنی احباب کو علم کی ایسی باتیں خوب ذہن نشین ہو کر یاد رہتی ہیں، جو اہم مواقع اور ان کی نیک کوششوں کی ترجمانی کرتی ہیں، پس ہمارا فرض ہے کہ اپنے تمام عزیزوں کے پیش کردہ پھولوں اور گلہائے حسین وجمیل جیسے نیک کاموں کو نہ صرف زبانی یاد کریں، بلکہ علم وحکمت کی زبان میں اسکی ترجمانی کرنے کے لئے کوشش بھی کریں، کیونکہ مسگار، ہونزہ، گلگت، کراچی، لنڈن، کینیڈا، امریکا، وغیرہ میں ہمارے عزیزانِ علمِ امامت کے پھول

Institute for Spiritual Wisdom Luminous Science

اُگا رہے ہیں، تاکہ ایک دُنیا شہدِ شیریں اور عِطر کی دولت سے مالامال ہو، یہی سبب ہے کہ ہمارے احباب بعض مواقع پر ظاہری پھولوں کو بھی بطور تحفہ پیش کرتے ہیں تاکہ اصل حقیقت کی علامت اور دلیل ہو، اور جاننے والے حضرات ان معنوں اور اشاروں کو سمجھ سکیں۔

۸۔ دُنیائے فانی مجموعاً عالمِ باقی کی دائمیت کی روشن ترین دلیل ہے، یہاں کے مُرجھانے والے پھُول زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ علم اور رُوحانیت کے پھول سدا بہار ہُوا کرتے ہیں، جن کی عِطر افشانی کبھی کم نہیں ہو سکتی، وہ پھول صرف ایک ہی ہے مگر ہزار بلکہ بے شمار پھولوں کی شکل میں جلوہ نمائی کرتا ہے، تاکہ ظہورِ کثرت از وحدت، اور رجوعِ کثرت بوحدت کی حقیقت پر روشنی پڑے، جیسے دستِ خدا کائنات و موجودات کو، ہر لحظہ پھیلاتا بھی ہے اور مُٹھی میں لپیٹتا بھی ہے، تاکہ رجوع اور ہدایت[۵] کا سِلسلہ ایک ساتھ جاری رہے۔

۹۔ ہر چیز اور ہر چہرہ اپنی ہلاکت کے پیشِ نظر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا رہتا ہے کہ ہر شئی ہلاک ہو جاتی ہے مگر چہرۂ خدا ہلاکت و فنا سے پاک و برتر ہے، اور لوگوں کی ہلاکت دو طرح سے ہے: جہالت و نادانی کی تاریکی میں، اور علم و معرفت کی روشنی میں، پس جہاں ظلمت ہے، تو وہاں کچھ بھی

---

[۵]: شروع کرنا۔

نظر نہیں آئیگا، اور جس مقام پر نور ہو، وہاں چہرۂ خدا میں ہر چہرہ فنا ہوتا ہُوا دکھائی دے گا، اور اس سے بڑھ کر کوئی سعادت ہو نہیں سکتی، کہ کوئی شخص اسی طرح اپنی اصل سے واصل ہو جائے، اور اپنی انا کو مرتبۂ ازلی میں پائے۔

۱۰۔ "ازل" بظاہر ایک سہ حرفی لفظ ہے، مگر اس کی حقیقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا سب سے بڑا خزانہ پوشیدہ ہے، جسمیں تمام گوہرہائے معرفت جمع ہیں، جس طرح کسی بادشاہ کے سب سے بڑے خزانے میں بصورتِ سِکّہ اور زر و گوہر سب کچھ سمیٹا ہُوا موجود ہوتا ہے، چنانچہ اسرارِ ازل سے بالاتر کوئی سِرّ (بھید) نہیں، مگر بڑی عجیب بات تو یہ ہے کہ وہاں جتنے الفاظ و اصطلاحات مقرر ہیں وہ سب کے سب چہرۂ خدا اور اس کی گوناگون تجلّیوں کے لئے ہیں، کیونکہ وہ مقام ایسا نہیں کہ وھاں وجھہ اللہ کے سِوا کوئی چیز ٹھہر سکے (۲۸/۸۸، ۵۵/۲۷) پس ازل، ابد، اور دہر وجہِ خدا کی حقیقتِ دائمیت کے نام ہیں، جسمیں انسان کو اس طرح فنا ہو جانا ہے کہ اس کی بشریت کا نام و نشان ہی مٹ جائے، اور وہ بالکل شیءِ مذکور ہی نہ رہے (۷۶/۱)

۱۱۔ اگر ازل بعید سے بعید ترین ماضی کا کوئی بے پایان زمانہ ہوتا، تو وقت گزر جانے کے ساتھ ساتھ لوگ اس سے دور ہوتے چلے جاتے، مگر خدائے مہربان نے ایسا نہیں کیا، چنانچہ قرآنِ حکیم کا فرمانا ہے کہ اللہ تعالیٰ

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

انسان کی رگِ جان سے بھی نزدیک تر ہے (۵۰ / ۱۶) پس جہاں خدا اس قدر نزدیک ہو، وہاں ازل اور دہر کس طرح دور ہو سکتا ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ جس منزلِ آخرین میں دیدارِ خداوندی کا سب سے عظیم شرف حاصل ہو جاتا ہے، اسی منزل میں سب کچھ موجود ہے، اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی بڑا یا چھوٹا بھید مقامِ دیدار سے ہٹ کر ہو، جبکہ حکمتِ قرآن یہ فرماتی ہے کہ ہر چیز کو علمی و عرفانی طور پر چہرۂ خدا سے قربان کر دو (۲۸ / ۸۸، ۵۵ / ۲۷)، تاکہ تم اس کے ظہورات و تجلیات میں ہر چیز دیکھ سکو گے اور سورۂ رحمان کا واضح مفہوم اور مقصد و منشا یہی ہے۔

۱۲۔ دیکھئے اور توجہ سے سُنیئے کہ قرآنِ حکیم میں ازل کا تذکرہ موجود ہے، چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ربِّ کریم کے سب سے بڑے دیدار کے لئے درخواست کی، تو اُس وقت بحالتِ روحانی مقامِ ازل آپؑ کے سامنے تھا، آپ اسرارِ ازل کا مشاہدہ کر رہے تھے، اور بحرِ حیرت میں ڈوب رہے تھے، پس اللہ جلّ شانہٗ نے اپنی بے مثال تجلّی کا بارِ گران کوہِ عقل پر ڈال دیا، جس سے وہ پارہ پارہ ہو کر بے شمار جواہر میں تقسیم ہو گیا، تاکہ حضرت موسیٰؑ کے لئے یہ علمی دیدار جو بہت سی قسطوں میں ہے آسان ہو جائے، پس حقیقی علم میں خدائے بزرگ و برتر کا رنگِ نور اور حسن و جمال موجود ہے، اور ہر عرفانی بھید میں اسکا ایک دیدار پوشیدہ ہے۔

۱۳۔ حضورِ اکرم فخرِ بنی آدم رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

نے جس شان سے حقائق و معارفِ ازل و ابد کا مشاہدہ کیا، اس کا ایک حکیمانہ بیان سورۂ نجم (۵۳ / ۱-۱۸) میں فرمایا گیا ہے، ان اٹھارہ آیاتِ مقدسہ میں جس طرح سردارِ رُسُلؐ کی معراج مرتبۂ ازل کے ساتھ واصل نظر آتی ہے، وہ انتہائی حیرت انگیز ہے، جیسے ستارے کا گرنا، یعنی مُظاہرۂ گوہرِ عقل، اور دوسری مثال میں قلمِ قدرت کی حرکتِ ازلی، پھر آنحضرتؐ کی انفرادی راہ یابی اور اجتماعی راہ نمائی کی تعریف و توصیف، جس میں نہ صرف حضورِ انورؐ کی ازل و ابد تک رسائی کا اشارہ موجود ہے، بلکہ آپؐ کی کامیاب ہدایت و رہنمائی کا تذکرہ بھی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس منزلِ آخرین کی نسبت سے اپنے محبوب پیغمبرؐ کو مومنین کا رفیقِ روحانی (صاحبکم) کہہ کر یاد فرمایا ہے اور کوئی شک نہیں کہ حضورِ اکرمؐ کے اِس نامِ مبارک میں اور اس آیۂ کریمہ میں اہلِ ایمان کے لئے یہ بشارت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی علیہ وآلہٖ وسلّم کی پیروی میں گنجِ ازل تک رسا ہو سکتے ہیں، جو گوہر ہائے اسرارِ نبوت و امامت سے مملو ہے۔

۱۴۔ آنحضرتؐ کی معراجِ روحانی اور مقامِ ازل کا دوسرا تذکرہ سورۂ بنی اسرائیل (۱۷ / ۱) میں فرمایا گیا ہے، جس میں المسجد الاقصا (انتہائی دور کی مسجد یا آسمانی مسجد) سے درجۂ ازل مراد ہے، جو علم و حکمت کی بے پایاں برکتوں کا منبع و مخزج ہے، اور وہ مرتبہ مسجد اِن معنوں میں ہے، کہ وہاں پیغمبرانہ، اولیائی، اور عارفانہ عبادت ہُوا کرتی ہے ص۱

ص۱: دور کی مسجد کی ایک اور تاویل آخری اسمِ اعظم ہے۔

۱۵۔ انبیاء و اولیا (أئمہ) کی ذواتِ مقدسہ جس طرح اسرارِ ازل و ابد تک رسا ہو کر ان کا عرفانی مشاہدہ کر لیتی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن یہ سوچنا اور جاننا انتہائی مشکل کام ہے کہ آیا مومنین کو کبھی ان حقائق و معارف کا مشاہدہ اور تجربہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تو آیئے ہم اس کے بارے میں قرآنِ حکیم میں دیکھتے ہیں:۔

۱۶۔ قرآن کریم کی سب سے زیادہ فیصلہ کُن آیات وہ ہیں، جن میں نمایاں طور پر نور کا ذکر موجود ہے، چنانچہ نور تو خدا، رسولؐ، اور امامؑ کا ہے، لیکن شرطِ اطاعت کی بجاآوری کے بعد یہی نور مومنین کا بھی ہو جاتا ہے، ملاحظہ ہو سورۂ حدید (۵۷/۱۲، ۵۷/۱۹) اور سورۂ تحریم (۶۶/۸) اب آپ سے برائے مکمل توجہ یہ سوال کرتا ہوں کہ نور کے دائرۂ کار میں کیا کیا افعال داخل ہیں؟ اور کون کون سے کام اس دائرے سے باہر ہیں؟ آپ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ نور ازل اور ابد کے بھیدوں پر روشنی نہیں ڈال سکتا، اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نور کا دائرہ محدود ہے، جبکہ نور کی روشنی ہمہ رس اور ہمہ گیر ہے، اس بیان سے ظاہر ہے کہ نور ہر سطح کے مشاہدات اور ایک کامل معرفت کیلئے مقرر ہے۔

۱۷۔ نور کے بہت سے درجات ہیں، تاہم آسانی کی خاطر اس کے تین بڑے درجوں کے نام بتائیں گے، اور وہ یہ ہیں: علم الیقین، عین الیقین

اور حق الیقین، جیسے نورِ خورشید کے تین مراتب ہیں؛ الف؛ صبح صادق، بادلوں کے ساتھ روشنی، درختوں کے نیچے روشنی ب؛ دھوپ، جس میں کوئی سایہ نہیں۔ ج؛ سورج خود جو روشنی کا سرچشمہ ہے، یہاں اصل بحث حق الیقین کے بارے میں ہے، کہ اُس تک مومنین پہنچ سکتے ہیں یا نہیں؟ لیکن مُحَوّلۂ بالا آیاتِ مُقدّسہ میں اچھی طرح سے غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ جو نور مومنین کے آگے اور داہنی طرف دوڑتا ہے وہ نورِ حق الیقین ہے، یعنی وہ دھوپ نہیں، بلکہ سورج خود ہی ہے، اَئنی روحانیت کے عالمِ عُلوی میں نورِ وحدت کا طلوع وغروب ہو رہا ہے، تاکہ صبح ازل سے لیکر شامِ ابد تک جو کچھ حقائق ومعارف اور عظیم اسرار ہیں، اُن پر روشنی پڑے، یعنی یہی ہے نورِ عقل کا وہ مظاہرہ، جس میں تمام لامکانی اور لازمانی اسرار (بھید) محفوظ ہیں۔

نوٹ: گلہائے معنوی نہ صرف ایک تاریخ ساز مضمون ہے بلکہ علم وعرفان کے اعتبار سے بھی اس کی بہت بڑی اہمیت ہے، لہٰذا آپ اس کے مطالب کو خوب ذہن نشین کرلیں۔

نصیر الدین نصیر ہونزائی
لنڈن
۲۷، نومبر ۱۹۸۶ء

نوٹ؛ مُحَوّلہ آیات کو قرآنِ مجید میں دیکھئے

عالمِ لامکان

۱۔ دونوں جہاں میں سے ایک تو مکان ہے، یعنی عالمِ جسمانی، جس کے ابعادِ ثلاثہ (طول، عرض، عُمق) ہوتے ہیں، اور دُوسرا لامکان/ عالمِ روحانی ہے، جو بہت سی صفات میں عالمِ ظاہر کے برعکس ہے، کیونکہ وہ غیر مادّی، غیر مکانی، اور لطیف ہے، لہٰذا اس کے بارے میں درحقیقت ایسا کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا، جس کا تعلق جسم سے یا مکان و زمان سے ہو، جیسے کسی کا یہ پوچھنا کہ لامکان کہاں ہے؟ یہ سوال نادرست اور غیر منطقی ہے، جبکہ "لامکان" کے معنی میں مکانیت (جگہ) طرف، وغیرہ کی نفی موجود ہے، نیز لامکان کے متعلق یہ پوچھنا بھی درست نہیں کہ وہ کب پیدا ہُوا؟ یا کب سے موجود ہے؟ اس لئے کہ یہ سوال مادّی چیزوں سے تعلق رکھتا ہے، مگر مجازاً ایسا کوئی بیان ہو سکتا ہے، اور اس نوعیت کی تشبیہات و تمثیلات ہو سکتی ہیں۔

۲۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے اِس کائنات کے

ختم وفنا ہوجانے کا تصور کریں، تو اسی کے ساتھ ساتھ وجودِ زمانہ کا تصور بھی ختم ہوجائے گا، اِس لئے کہ زمانہ اور وقت بحیثیت مجموعی آسمان اور سیاروں کی گردش سے بنتا ہے، اِس کے بغیر دن رات، ماہ وسال کا کوئی وجود ہی نہیں، پس ظاہر ہے کہ جس طرح یہ دُنیا جسم اور مکان وزمان ہے' اسی طرح اِس کے مقابل میں دوسرا عالم روح اور لامکان ولازمان ہے' یعنی وہ مادّیت کی کوئی جگہ نہیں، اور نہ ہی اس میں ماضی، حال، اور مُستقبل ہے، مگر بیشک اس میں " دھر" ہے، یعنی زمانۂ ساکن (ٹھہرا ہُوا زمانہ) کہ وہ گذرتا نہیں۔

۳۔ صبحِ صادق کے کچھ دیر بعد جب سورج نظر آتا ہے، تو لوگ عادتاً کہنے لگتے ہیں کہ سُورج طلوع ہوگیا، یا کہتے ہیں کہ سورج نکل آیا، اور شام کے وقت جب دکھائی نہیں دیتا، تو کہا جاتا ہے کہ سورج ڈوب گیا، جبکہ حقیقتِ حال کچھ اور ہے، وہ یہ کہ سورج خود نہ طلوع ہوجاتا ہے، اور نہ غروب' کیونکہ وہ اپنی جگہ پر ساکن ہے، بلکہ زمین ہی گردش کرتی ہے جسکی وجہ سے دن رات کا تعیُّن اور مختلف اوقات کا ظہور ہوتا ہے، چنانچہ حقائق ومعارف سے متعلق لوگوں کے نظریات دو قسم کے ہُوا کرتے ہیں، ایک وہ نظریہ جو عادت' روایت، اور چشمِ ظاہر کے مطابق ہوتا ہے، اور دوسرا وہ نظریہ، جو اصل حقیقتِ حال کے مطابق ہو، پس قرآنِ حکیم نے بطریقِ حکمت نظریۂ اوّل کو مثال کے طور پر لیا، اور نظریۂ دوم کو ممثول کا درجہ عطا کر دیا، جیسا کہ سورۂ رحمان کا

ایک ارشاد (۵/۵۵) ہے: سورج اور چاند ایک مقرر حساب سے (چل رہے) ہیں۔ ظاہر ہے کہ سورج اس طرح نہیں چلتا، جس طرح چاند چلتا ہے، پس یہ عالمِ دین کے تین درجوں کے شمس و قمر کی مثال ہے، یعنی درجۂ اوّل کے سورج اور چاند عقلِ کُل اور نفسِ کُل ہیں، درجۂ دُوم کے سورج اور چاند ناطقؑ و اساسؑ اور درجۂ سوم کے آفتاب و ماہتاب امامؑ اور باب (حُجّتِ اعظم) ہیں، کیونکہ خورشید و ماہ کے مقامات تین ہیں: عالمِ روحانی، زمانۂ نبوّت اور دَورِ امامت۔

۴۔ جس طرح معرفتِ نفس (روح/ذات) حضرتِ ربِّ عزّت کی معرفت کا وسیلۂ واحد ہے، اسی طرح یہی پہچان اسرارِ لامکان کی شناخت کا ذریعہ بھی ہے، چنانچہ تذکرۂ عالمِ شخصی کے بغیر حقائق و معارفِ لامکان و لازمان کو کما حقّہ سمجھنا اور سمجھانا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے، پس یہاں اس انتہائی اہم موضوع کے سلسلے میں لازمی اور ضروری طور پر پرسنل ورلڈ (عالمِ شخصی) کا حوالہ دیا جاتا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی تمام تر نشانیاں عظیم معجزات، اور اسرارِ ازل و ابد مخفی ہیں (۴۱/۵۳، ۵۱/۲۱) جیسے قرآنِ کریم کا ایک بہت ہی عالی شان مضمون "عالمین" ہے، جو قرآنِ پاک میں ۷۳ دفعہ

نوٹ: اس مقالے میں درجۂ اعلیٰ کے بہت ہی مشکل سوالات کیلئے درست جوابات مہیا کئے گئے ہیں۔ الحمد للہ علی منّہٖ و احسانہٖ

مذکور ہے، اور حضرتِ امام جعفر الصّادق علیہ السّلام کا ارشاد ہے کہ عالمین سے انسان مراد ہیں، کیونکہ ہر شخص اپنی ذات (رُوح) میں ایک مستقل عالم (دُنیا) ہے، جس میں اگر چشمِ حقیقت بین سے دیکھا جائے، تو عقلی، علمی، اور روحانی کیفیات میں خدا کی بادشاہی کا سب کچھ موجود ہے، اور کائنات و موجودات کی کوئی چیز ایسی نہیں، جس کا نمونہ عالمِ شخصی میں نہ ملتا ہو۔

۵ - اب ہم یقینِ کامل سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ آدمی کی عقل و رُوح عالمِ لامکان ہے، جو مکان و زمان سے بالاتر ہے، جس کی ایک عام مثال دُنیائے خیال ہے اور عالمِ خواب کہ وہ مکان نہیں، اور نہ وہ زمانۂ ظاہر کی طرح کوئی زمان ہے، بلکہ یقیناً خیال بھی اور خواب بھی لامکان ولازمان کا ایک واضح نمونہ ہے، کیونکہ یہ دونوں حالتیں بشرطِ علم و عمل مرتبۂ روحانیت کے ساتھ مُدغم ہو جاتی ہیں، جیسے انبیا علیہم السّلام کے خیال و خواب، کہ اگر اس حال میں رُوحِ قدسی کی روحانیت ممکن نہ ہوتی، تو اُن حضرات کو سوتے میں کوئی آسمانی اِشارہ نہ ہوتا۔

۶ - یاد رہے کہ دینِ اسلام کا اساسی اور بنیادی قانون اللہ تعالیٰ کی سُنّت ہے، اور اس کی پاک و منزّہ سنّت کی ایک خاص وضاحت یہ ہے کہ خداوندِ عالم "تخلیق در تخلیق" کرتا ہے (۳۹/۶)[1] یہی وہ قانونِ الٰہی ہے، جس کو قرآنِ

---

[1] خلقاً مِنۢ بعدِ خلقٍ (۳۹/۶) نیز ملاحظہ ہو: پہلی تخلیق: سُلالہ، دوسری تخلیق: نُطفہ، تیسری تخلیق: عَلقہ، چوتھی تخلیق: مُضغہ، پانچویں تخلیق: عِظام، چھٹی تخلیق: لحم، اور ساتویں تخلیق: خلقِ آخر (۲۳/۱۲-۱۴)

حکیم نے فطرت کا نام دیا (۳۰:۳۰) آپ اسے فطرت اللہ (۳۰:۳۰) کہیں یا سُنّتہ اللہ (۱۷:۷۷) بہرحال جو پیغمبرؑ خدا کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے، ان حضرات کی تکمیل جسم میں بھی اور روح میں بھی سُنّتِ تخلیق درتخلیق کے مطابق ہوئی تھی (۱۷:۷۷) اور اگر کسی عزیز کو اس بیان میں کوئی شک ہو، تو وہ متعلقہ آیاتِ مقدسہ میں سنجیدگی سے غور کر سکتا ہے، تاکہ اسی بنیاد پر یہاں اب جو حقائق و معارف بیان ہونے والے ہیں، ان کے سمجھنے میں کوئی دِقّت پیش نہ ہو۔

۷۔ کائناتِ ظاہر ہو، یا عالَمِ دین، یا عالَمِ شخصی، کوئی عالم چاہے خلقی ہو یا امری[1]، ہرحال میں وہ قانونِ فطرت کے تحت ہوتا ہے، اور اس میں تخلیق درتخلیق کا عمل یا نمونہ جاری رہتا ہے، جس کی وجہ سے اس میں کئی طرح کی وُسعت پیدا ہو جاتی، مثال کے طور پر اس کے واقعات اور علم میں کشادگی پیدا ہو جاتی ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے: اور ہم نے آسمان کو اپنے ہاتھوں سے بنایا اور بیشک ہم وُسعت والے ہیں (۵۱:۴۷) اس آیۂ پُرحکمت میں ذات و کائنات کے بہت سے بھید پوشیدہ ہیں، مِن جملہ ایک اِشارہ یہ ہے کہ تخلیق درتخلیق کی بدولت ہر عالم میں معنوی اور علمی فراخی پیدا ہو جاتی ہے، جیسے عالَمِ دین زمانۂ آدمؑ میں پیدا ہُوا تھا، لیکن بعد کے ناطقوں کی شریعتوں سے بھی اس کی تخلیق ہوتی چلی آئی، اِسی طرح حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلّم

---

[1] عالَمِ امر میں تخلیق درتخلیق کا صرف مظاہرہ ہوتا ہے۔

کے ظہورِ اقدس تک عالمِ دین میں کُل چھ دفعہ تخلیق در تخلیق ہوئی، جسکے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ (٧/٥٤، ١٠/٣، ١١/٧، ٢٥/٥٩، ٣٢/٤، ٥٠/٣٨، ٥٧/٤)

٨۔ پروردگارِ عالم نے اپنے محبوب رسول کو نہ صرف قرآنِ کریم کی دولتِ پائندہ سے مالامال فرمایا، بلکہ آپ کو سبعِ مثانی بھی عطا کر دیا (١٥/٨٧) تاکہ حضورِ انورؐ کی دعوتِ حق کا کام قیامت تک جاری رہے، یہ سبعِ مثانی (سات دُہرائی جانے والی چیزیں) جو قرآنِ پاک کے علاوہ ہیں، وہ آلِ مُحمدؐ کے أئمۂ طاہرینؑ ہیں، جو بحکمِ خدا اپنے سلسلے میں سات سات کے ادوارِ کہین[1] بناتے آئے ہیں، چنانچہ رسولِ خداؐ کے علم وحکمت سے، جس کا دروازہ مرتبۂ امامت ہے، آخری بار عالمِ دین کی تخلیق ہوگئی، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم مرکزِ انبیا وأئمہ ہیں، لہٰذا آپؐ کا دین ماضی اور مستقبل کے تمام ادوار پر محیط ہوگیا، اور آپ کا دَور دراصل دَورِ اعظم قرار پایا، اِس اعتبار سے سترِ انبیا ورُسُلؑ کا عالمِ دین جو زمانۂ آدمؑ سے لیکر قیامت تک ہے، وہ آٹھ دنوں میں مکمّل ہوگیا، جیساکہ قرآنِ پاک (٤١/٩-١٢) میں اس کا ذکر موجود ہے۔

٩۔ حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کی شریعتیں اُن دو دنوں کی مثال ہیں، جن میں عالمِ دین کی زمین بنائی گئی، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت

---

[1]: ادوارِ کہین، چھوٹے ادوار، جن میں سے ہر ایک میں ستا اماموں کا ایک دَور رہتا ہے

عیسیٰؑ، اور آنحضرتؐ کی شرائع وہ چار دن ہیں، جن میں زمینِ دین پر پہاڑ پیدا کئے گئے اور اُن میں گوناگوں برکتیں اور قوتیں رکھی گئیں، اور مرتبۂ امامت و قیامت وہ دو دن ہیں، کہ ان میں روحانیت کے سات آسمان وجود میں آگئے۔

۱۰۔ عالمِ شخصی کا سب سے مکمل نمونہ انسانِ کامل ہے، جس کے بابرکت وجود کے دو رُخ (پہلو) ہُوا کرتے ہیں، یعنی وہ جسم و جسمانیت کے اعتبار سے مکان و زمان کے تحت بھی ہے، اور روح و روحانیت کے لحاظ سے لامکان ولازمان بھی ہے، تاکہ اس کی پاک و پاکیزہ ہستی مکان و لامکان کے درمیان پُل کی طرح، اور عالمِ سفلی سے عالمِ عُلوی تک سیڑھی کی طرح کام کر سکے، شروع سے لیکر اب تک جتنے بھی انسانانِ کامل ہوئے ہیں، وہ سب جسمانی طور پر الگ الگ زمانوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن عقل و روح کے جس مقام پر مکان و زمان کی تمام مسافتیں ختم ہو جاتی ہیں، وہاں وہ سارے نفسِ واحدہ کی طرح ایک ہو جاتے ہیں (۳۱/۲۸)

۱۱۔ اگر یہاں یہ کہا جائے کہ سب انسان مقامِ ازل پر ایک ہی نورانی شخص کی صورت میں چہرۂ اصل سے واصل تھے، پھر اس چہرے کی بے شمار تصویریں بنا کر اس دُنیا میں لائی گئیں، تو یہ بات ایک روشن حقیقت ہوگی، تاہم اس کے ساتھ یہ بھی جاننا ہے کہ عکاسی اور تصویر کشی سے اصل (ORIGINAL) میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی ہے، لہٰذا لوگ مرتبۂ ازل میں اب بھی ویسے متحد اور شخصِ واحد ہیں، جیسے دُنیا میں آنے سے پہلے تھے،

اور یہ نکتہ اُن حضرات کے لئے زیادہ سے زیادہ دلنشین ہو سکتا ہے، جو اس کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں، الغرض انسان کا اپنی اصل کی طرف رجوع صرف علمی اور عرفانی صورت میں ممکن ہے، اور یہ بات خود شناسی کے تحت آتی ہے۔

۱۲۔ یہ ہمارے لئے پہلا سبق ہے کہ عقلِ کُل سے نفسِ کُل پیدا ہو گیا، یہ دوسرا سبق ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے پیدا ہو گئے، اور یہ تیسرا اور آخری درس ہے، کہ کوئی بھی کسی سے پیدا نہیں ہُوا، کیونکہ پیدائش عالمِ خلق میں ہے اور عالمِ امر میں نہیں، لہٰذا وہاں جو کچھ مشاہدے میں آتا ہے، وہ صرف ایک نورانی منظاہرہ ہے، جو عرفانی مقصد کے پیشِ نظر دکھایا جاتا ہے، جس میں تمام حقیقتوں اور معرفتوں کی مثالیں جمع ہیں۔

اور یہاں یہ بھی یاد رہے کہ اس حکمتِ مُدَوَّر (GLOBULAR WISDOM) میں کبھی فعلِ خدا پہلے نظر آتا ہے، کبھی گوہرِ عقل، اور کبھی کلمۂ کُن، اس کا سبب دائرۂ دوائر[^1] ہے، جس پر مسلسل یہ ظہورات ہوتے رہتے ہیں، جس کو اگر بنظرِ کُلّی دیکھا جائے تو اس میں کوئی تقدیم و تاخیر نہیں، کیونکہ یہ سب لامکان و لازمان کے مُظاہرات ہیں۔

---

[^1]: دائرۂ دوائر، سب سے آخری دائرہ، جس میں تمام دائرے داخل ہیں، جو حکمتِ مُدَوَّر کے دائمی فعل سے بنتا ہے۔

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی
لنڈن
۲/۱۲/۸۶

روح اور مادّہ

کیا یہ تصوّر درست ہے کہ روح اور مادّہ (جسم) دو الگ الگ چیزیں ہیں؟ یا یہ دراصل ایک ہی شئی ہے؟ اگر یہ دونوں جُدا جُدا ہیں، اور ان کی حقیقی وحدت کا کوئی مقام ہی نہیں، تو پھر ان کے درمیان جو حدِ فاصل ہے، وہ کہاں واقع ہے؟ اور کیا ہے؟ اور اگر یہ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، تو وہ حقیقت کیا ہے؟ آیا ازل میں روح تھی؟ یا جسم تھا؟ جب چہرۂ خدا کے سامنے ہر چیز ہلاک ہو جائے گی، تو اُس وقت روح اور مادّہ کا کیا عالم ہوگا؟ کیا عالمِ ذرّ میں جمادات کی روحیں بھی حاضر ہوتی ہیں؟ آیا پتّھر اور لوہا جیسی چیزوں میں بھی روح پوشیدہ ہو سکتی ہے؟ اگر اُن میں روح موجود ہے، تو وضاحت کیجئے۔ ان جیسے مسائل ومباحث سے بحث کرنے کے لئے (اِن شاء اللہ) ذیل میں چند دلائل درج کئے جاتے ہیں:-

دلیل ۱: روح اور مادّہ اگرچہ ظاہراً دو چیزیں ہیں، اور عمومی تصوّر بھی یہی ہے، تاہم حقیقت میں یہ ایک ہی شئی ہے، مثال کے طور پر اگر یخ (برف)

اور پانی ظاہری شکل اور کیفیت میں مختلف اور جُدا نظر آتے ہیں، تو کیا ہوا، جبکہ یخ کے پگھل جانے سے پانی بن جاتا ہے، اور پانی کے مُنجمد ہونے سے یخ بن جاتی ہے، اس کے علاوہ ان کی اصل وحدت و سالمیت بادلوں میں موجود ہے، چنانچہ مادہ روحِ مُنجمد ہے، اور روح مادّۂ محلول اور ان دونوں کا مرکزِ وحدت وہ جسمِ لطیف ہے، جس نے ساری کائنات کو اپنے اندر ڈبو لیا ہے، جس کو حکمائے قدیم نے ہَیُولیٰ[1] کہا، اور جدید سائنس میں اس کا نام ایتھر ہے۔

دلیل ۲ : بفرمودۂ قرآنِ حکیم (۲۴/۳۵) نورِ خدائے برحق روشنیوں کا ایک ایسا انتہائی عظیم سمندر ہے کہ اس میں آسمان و زمین کا ذرّہ ذرّہ اندر سے بھی اور باہر سے بھی مُستغرق ہے، پس کون کہتا ہے کہ اس نورِ جان و جانان میں حرارتِ حیات نہیں، اور یہ ہمیشہ ہر چھوٹے سے چھوٹے ذرّے کو ایک مخفی اور خاموش زندگی کی تب و تاب عنایت نہیں کر سکتی ہے، وہ کیسا انسان ہوگا، جو یہ خیال کر سکے کہ الحیّ القیّوم کا نور بلندی و پستی کے ہر ایٹم اور ہر ریزے کو منوّر نہیں کر سکتا، سو اس بیان سے ظاہر ہے کہ کائنات کے ہر ذرّے میں روح بصورتِ نورِ پنہان ہے۔

دلیل ۳ : یہ جہان کیا ہے؟ اور کس مقصد کے لئے بنا ہے؟ یہ گویا قدرت کا ایک زندہ کارخانہ ہے، جس میں مختلف درجات کے ذی حیات کی تخلیق ہوتی رہتی ہے، دُنیا والوں نے ابتک کوئی ایسی مِل (MILL) نہیں بنائی، جو خام مال کی محتاج نہ ہو، اور ہمیشہ خود بخود کام کرتی رہے، لیکن صرف کارخانۂ

فطرت ہی ایسا ہے، جو بحیثیتِ مجموعی خود ہی زندگی کی رَو بھی ہے، اور خود ہی مواد بھی، اور یہ کارگاہ بحکمِ خدا خود بخود ہمیشہ چلتی رہتی ہے، اگر کارخانۂ کائنات سرتاسر زندہ اور روح سے بھرپور نہ ہوتا، تو حکمائے قدیم اس کے اجزا کو زندہ مخلوق سے تشبیہ نہ دیتے، جیسے انہوں نے کہا: نو ۹ باپ (نو آسمان) چار (۴) مائیں (چار عناصر) اور تین ۳ بچے (جماد، نبات، حیوان) اس سے یہ حقیقت روشن ہوئی کہ یہ جہان اندرونی طور پر زندہ ہے، اور اسی وجہ سے یہ کارخانۂ زندگی کا درجہ رکھتا ہے۔

دلیل ۴: سورۂ حدید (۵۷/۲۵) میں قرآنی ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوہے کو نازل کیا، لیکن اہلِ دانش جانتے ہیں کہ آسمان سے لوہے کے چٹان نہیں گرائے گئے، مگر جگہ جگہ لوہے کی روح نازل کی گئی، جس سے لوہا پیدا ہوا، اسی قانونِ روح کے مطابق روح ہی سے تمام معدنیات اور جواہر پیدا ہوئے، جیسے آپ کو علم ہے کہ موتی اور مونگا دونوں پتھر کی طرح ہوتے ہیں، حالانکہ ان میں سے پہلا روحِ حیوانی کی پیداوار ہے، اور دوسرا روحِ نباتی کی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہر چیز کی روح ہے، لہٰذا معدنیات کی بھی روح ہے۔

دلیل ۵: قرآنِ حکیم میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو کُنْ (ہو جا) فرماتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے، جیسے اُس پاک و برتر نے آتشِ نمرود سے فرمایا: کُونی بردًا (۲۱/۶۹) تو ٹھنڈی ہو جا، تو وہ ٹھنڈی ہو گئی،

اسی طرح خداوند تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے کچھ نافرمان لوگوں سے کہا، کُونُوا قِرَدَۃً (۲/۶۵) تم بندر بن جاؤ، تو وہ بندر بن گئے، اور یہ سب کچھ روحانی طور پر زیادہ صحیح ہے، پس اگر خدا کسی کی رُوح کو پتھر یا لوہا بنانا چاہے تو یہ امر کس طرح ناممکن ہو سکتا ہے، جیسے سورۂ بنی اسرائیل (۱۷/۵۰) میں اس کا ایک واضح اشارہ موجود ہے، پس جسم نہیں بلکہ رُوح مسخ ہو جاتی ہے، یعنی روح پتھر، لوہا، وغیرہ بن جاتی ہے [1]۔

دلیل ۶: حضرت نوح علیہ السلام کا سب سے بڑا اور عالمگیر طوفان روحانی شکل میں برپا ہوا تھا، چنانچہ خداوندِ عالم نے بروقت آپؑ کو حکم دیا کہ اے نوحؑ ہر قسم کی چیزوں (یعنی جمادات، نباتات، اور حیوانات کے ذرّاتِ ارواح) سے نر و مادہ کا جوڑا یعنی دو دو لے لو (۱۱/۴۰) چنانچہ حضرتِ نوحؑ نے اپنی کشتیٔ ہستی (عالمِ ذرّ) میں کُل چیزوں کی ہر گونہ روحوں سے دو دو جوڑوں کو لیا، تاکہ اس طوفانِ ہلاکت کے بعد ایک نئی دُنیا بسالی جائے۔ کہ اس کی ہر چیز خدا کے خزانے سے ہو (۱۵/۲۱) جو اُس وقت حضرت نوحؑ میں رکھا ہوا تھا، اور یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اِسی طرح تمام چیزوں کی نمائندہ روحیں انسانِ کامل میں جمع ہو جاتی ہیں کہ وہی خزانۂ الٰہی ہے (۱۵/۲۱) اور وہاں سے

---

[1] ارشاد ہوا ہے: قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا (۱۷/۵۰) (اے رسولؐ) آپ کہہ دیجئے کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا۔

ہر چیز دُنیا میں پھیل جاتی ہے۔

دلیل ۷: سورۂ بنی اسرائیل (۱۷/۴۴) میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ آسمان و زمین میں کوئی چیز ایسی نہیں جو خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا کی تسبیح نہ کرتی ہو، بے شک خدائے پاک کی یہ تسبیح چیزیں ایک طرح سے اپنی اپنی جگہ پر بھی کرتی ہیں، لیکن ان کے ذرّاتِ ارواح جس طرح انسانِ کامل کے عالمِ شخصی / عالمِ ذرّ میں تسبیح پڑھتے ہیں، وہ ایک عظیم روحانی معجزہ ہے، یہی تسبیح خوانی ہے، جس کو معجزۂ لحنِ داؤدی کہا جاتا ہے۔ (۲۱/۷۹، ۳۴/۱۰، ۳۸/۱۸) اور ہاں، اس میں صورِ اسرافیل کا کمال بھی ہے۔

دلیل ۸: سورۂ حج کے ایک ارشاد (۲۲/۱۸) کا یہ مفہوم ہے کہ جو لوگ آسمانوں میں ہیں، اور جو لوگ زمین میں ہیں، اور آفتاب، ماہتاب، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے، اور بہت سے لوگ اپنے اپنے مقام پر بھی اور بصورتِ ذرّاتِ روحانی عالمِ شخصی میں بھی خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔ چونکہ آیۂ کریمہ کا خطاب، جیسا کہ اَلَمْ تَرَ (کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا) سے ظاہر ہے، آنحضرتؐ سے فرمایا گیا ہے، لہٰذا ہم یہ حقیقت یقینِ کامل سے بیان کریں گے کہ رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے عالمِ ذرّ میں مذکورہ خلائق کے ذرّاتِ ارواح خدائے برحق کو سجدہ کرتے تھے، اور یہ سجدہ خصوصاً اطاعت و فرمانبرداری کے معنی میں ہے۔

دلیل ۹: آپ نے قبل ازین دلو کی حکمت کو ذہن نشین کر لیا ہوگا،

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

کہ کُل چیزیں دو دو کے جوڑوں میں ہیں، اور اس قانونِ دوئی سے کوئی چیز مُستثنا نہیں (۱۳/۳، ۳۶/۳۶، ۵۱/۴۹) سو جس طرح سجدہ کے دو مقام ہیں، اسی طرح تسخیر کائنات بھی دو جگہوں پر ہوتی ہے، جن میں سے ایک تو عالمِ ظاہر ہے، اور دُوسرا عالمِ ذرّ یا عالمِ شخصی، عالمِ شخصی میں کائنات بصورتِ ذرّاتِ روح مسخر ہو جاتی ہے، اور یہ واقعہ بحدِّ فعل بھی ہے اور بحدِّ قوّت بھی متعلقہ آیاتِ مقدّسہ کے لئے س۔خ۔ر کے تحت قرآنِ مجید کے الفاظ کو دیکھئے، جیسا کہ سورۂ جاثیہ کا ایک فرمان (۴۵/۱۳) ہے: اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو خدا نے تمہارے کام میں لگا دیا ہے، جو لوگ غور کرتے ہیں، ان کے لئے اس میں (قدرتِ خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں۔ پس امام شناسی کے سلسلے میں اس حقیقت کا جاننا بیحد ضروری ہے۔

دلیل نمبر ۱۰: چونکہ جمادات میں بحدِّ قوّت رُوح ہے، اور نباتات کی جڑیں مٹّی میں مضبوط ہیں، اس لئے ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ یہاں مادّہ اور رُوح کے درمیان حدِّ فاصل ہے، جب گوسفند کو ذبح کیا جاتا ہے، تو اس کی جان / رُوح نکل جاتی ہے، اور کچھ دیر کے بعد بالکل ٹھنڈی ہو جاتی ہے، اس حالت کو دیکھ کر شاید کوئی یہ خیال کرے کہ یہ جسم اور رُوح کے درمیان ایک واضح حدِّ فاصل ہے، لیکن ایسا نہیں، کیونکہ پھر بھی اس گوسفند میں بحدِّ قوّت رُوح ہے، جس کو فعلاً رُوح بنانے کے لئے گوشت کھایا جاتا ہے، اور اگر کسی وجہ سے یہ گوشت زیادہ عرصے تک پڑا رہے، تو اس میں کیڑے پیدا ہوں گے، کیوں کہ

اس میں ظہورِ زندگی کی صلاحیت موجود ہے، اس سے یہ حقیقت روشن ہوئی کہ مادّہ اور رُوح کے درمیان کوئی حدِّ فاصل نہیں۔

دلیل ۱۱: تخلیقِ عالم کے بارے میں دو نکتے ہیں، وہ یہ کہ اگر جُزوی طور پر دیکھنا ہے تو آفرینش کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی، اور اگر کلّی حیثیت سے مُشاہدہ کرنا ہو، تو اس کی نہ تو کوئی ابتدا ہے اور نہ ہی کوئی انتہا، اور قرآنِ حکیم کا یہی فیصلہ ہے، اب بات یُوں ہے کہ جس اعتبار سے پیدائش کا ایک سِرا ملتا ہے، اس لحاظ سے یہ کہنا درست ہے کہ مقامِ ازل پر خدا نے سب سے پہلے نورِ عقل کو پیدا کیا، پھر اس نے عقل سے نفسِ کُلّ کو اور اُس سے جسمِ کُلّ کو وجود میں لایا، اس کا مطلب یہ ہُوا کہ اللہ نے جس طرح یہ کائنات پھیلائی ہے، وہ اس کو اسی طرح لپیٹ بھی لیتا ہے، یعنی جسم رُوح میں فنا ہو جاتا ہے، اور رُوح عقل میں، پس معلوم ہُوا کہ رُوح اور مادّہ اگرچہ ظاہراً دو ہیں، لیکن در حقیقت یہ ایک ہی چیز ہے۔

دلیل ۱۲: انسانِ کامل بحدِّ فعل اور دُوسرے سب لوگ بحدِّ قوّت خدا کی ایک ایسی زندہ اور بولنے والی کتاب ہیں، کہ اس میں دونوں جہان کے جُملہ حقائق و معارف کی ساری مثالیں گھیر کر درج کی گئی ہیں (۸/۲۹) یہی کتاب مجموعۂ نامہ ہائے اعمال بھی ہے (۱۷/۱۴، ۱۸/۴۹) اور اس سے کوئی مثال باہر نہیں، چنانچہ اس کتاب / عالمِ شخصی پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ جس طرح عالمِ کبیر ایک گوہر سے بنایا گیا ہے، اسی طرح عالمِ صغیر ایک جوہر سے پیدا ہوا، وہاں

پہاڑوں میں رُوح مُنجمد بھی ہوئی ہے، اور معدنیات کی تکوین میں مصروفِ عمل بھی ہے، یہاں ہڈیوں کے خلیات میں ساکن بھی ہے اور مُتحرک بھی، جیسے درختوں کی زندگی رُوحِ نباتی سے ہے، ویسے انسانی بالوں کی ہستی بھی اسی سے ہے۔

دلیل ۱۳: اگرچہ رُوح زندہ ہے اور مادّہ مردہ، لیکن قرآنِ حکیم بار بار کہتا ہے اور اہلِ دانش دیکھتے ہیں کہ خدا وہ ہے جو تمام اضداد کو ایک دُوسرے سے پیدا کرتا ہے، اور اسی قانون کو سامنے رکھتے ہوئے فرمایا گیا۔ (ترجمہ): اور کون (ہے وہ جو) مردے سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردے کو نکالتا ہے (۱۰/۳۱) چنانچہ زمین مادّہ ہے اور مردہ (۳۰/۱۹، ۳۶/۳۳) جو رُوح سے بنائی گئی ہے، اور جب یہ کُلّی طور پر فنا ہو جائیگی، تو رُوح بن کر زندہ ہو جائیگی، جس طرح وہ ہر سال موسمِ خزاں میں جزوی طور پر مر جاتی ہے اور موسمِ بہار میں زندہ ہو جاتی ہے (۲۲/۵)

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

لنڈن

۸۶/۱۲/۶

چہرۂ خدا کی روشنی میں

۱۔ عنوانِ بالا کے کئی اعلیٰ مطالب ہیں، مِن جملہ ایک مطلب یہ بھی ہے کہ یہاں قرآنِ حکیم کی اُن عظیم الشّان اور حکمت آگین آیات کی روشنی میں بعض خاص حقائق و معارف بیان کئے جائیں، جو موضوعِ وجہ اللہ اور لِقائے خداوندی سے متعلق مذکور ہوئی ہیں، کیونکہ ان نورانی آیتوں میں اسرارِ معرفت اور انوارِ وحدت کا سب سے بڑا خزانہ پنہان ہے، جس کی تلاش میں ادیانِ عالم کے تمام لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر لگے ہوئے ہیں، اور اس گنجِ مخفی کو کون نہیں چاہتا۔

۲۔ اِس باعظمت موضوع کی اہمیّت و ضرورت کو اُجاگر کرنے، اور اس کی طرف کماحقّہٗ مکمّل توجّہ دلانے کی خاطر یہاں یہ چند سوالات درج کئے جاتے ہیں: الف: اساسی طور پر "وجہ" کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ ب: وجہ اللہ کا اصل

مطلب کیا ہے؟ آیا اس سے ذاتِ خدا مراد ہے، یا اس کے اصلی معنی (چہرۂ خدا) بجا ہیں؟ جب لفظِ "ذات" بھی عربی ہے، تو وہ خود اس آیۂ کریمہ میں داخل ہو کر "ذات اللہ" کیوں نہیں کہلایا؟ ج: اگر آپ کے نزدیک وجہ اللہ کا مطلب چہرۂ خدا ہے، تو پھر بتائیے کہ ذاتِ سبحانِ بیچون و بیچگون کا چہرہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص چہرۂ خدا کا قائم مقام ہے، یا اس کی نمائندگی کرتا ہے، تو دلیل کی روشنی میں دکھائیے کہ وہ کون ہے؟ د: دیدارِ خداوندی کے باب میں قرآنِ پاک کا کیا ارشاد ہے؟ سورۂ قیامت (۷۵) کی اس آیۂ مبارکہ کا کیا مطلب ہو سکتا ہے: اِلٰی ربّھا ناظِرۃ (۷۵/۲۳)؟ [1]

۳ــ یہ دینِ اسلام کا بنیادی عقیدہ بھی ہے اور حقیقت بھی، کہ حق سبحانہ وتعالیٰ اعضاء و جوارح سے پاک و برتر ہے، لیکن یہ امرِ عظیم سب پر روشن ہے کہ قرآنِ حکیم اور دینِ فطرت (اسلام) میں خلیفۂ خدا کا انتہائی بلند مرتبہ بھی ایک اساسی حقیقت ہے، اور اسی اصولِ خلافت اور قانونِ نیابت میں یہ واضح و صریح حکم موجود ہے کہ جس طرح خلیفۂ خدا روح اللہ، ید اللہ، لِسان اللہ، وغیرہ کہلاتا ہے، بالکل اسی طرح وہ وجہ اللہ (چہرۂ خدا) بھی ہے، جیسے حدیثِ شریف: مَن رَاٰنی فقد رَاَ الحق (جس نے مجھے

---

[1] اپنے پروردگار کو دیکھ رہے ہوں گے۔ سورۂ قیامت (۷۵/۲۳)

دیکھا تحقیق اُس نے خدا کو دیکھا) سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خدا کا مبارک چہرہ تھے، اس تصور کے بغیر آیاتِ وجہ اللہ کی حقیقی تفسیر ممکن ہی نہیں، مثال کے لئے ملاحظہ ہو:۔

۴__ ایک پُر از حکمت آیۂ کریمۂ وجہ اللہ کا ترجمہ یہ ہے: چہرۂ خدا کے سوا ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے (۲۸/۸۸) اب اگر چہرۂ خدا سے خلیفۂ خدا، یا خلیفۂ رسولؐ مراد لیا جائے، تو اس کی تفسیر و تاویل دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہوں گی، ورنہ اس کا مطلب و مفہوم یہ ہوگا کہ ہر چیز فانی ہے، یہاں تک کہ خدا کے اعضاء بھی (نعوذ باللہ) فنا پذیر ہیں، مگر صرف اس کا چہرہ ہی باقی رہے گا، لیکن دوستو! یہ نظریّہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟ نیز اگر ہم یہ کہیں کہ صرف ذاتِ خدا ہی باقی ہے، تو پھر اس کی منطق یہ ہوگی کہ دوسری جملہ اشیاء کے ساتھ صفاتِ الٰہیّہ بھی (نعوذ باللہ) ہلاک ہو جاتی ہیں، لیکن یہ عقیدہ کس طرح صحیح ہو سکے گا۔

۵__ یقیناً ہر پیغمبر اور ہر امام اپنے زمانے میں چہرۂ خدا کا کام کرتا ہے، اور یہ کسی دوسرے کا اصول ہرگز نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ قانون ہے، چنانچہ حضرت نوح علیہ السّلام اپنے وقت میں چہرۂ خدا ہونے کا درجہ رکھتے تھے، آپؑ کے طوفان

کے پس منظر میں ایک روحانی قیامت برپا ہوئی تھی، جس نے نہ صرف بے شمار نافرمان لوگوں ہی کو غرق و ہلاک کر ڈالا، بلکہ آیۂ وجہِ خدا کے ارشاد کے مطابق اس سے ہر مخلوق اور ہر شیٔ فنا ہوگئی، مگر جو مومنین سفینۂ ظاہر و باطن میں سوار ہوئے تھے، اور جتنے ذراتِ روحانی چہرۂ خدا کی کشتیٔ حکمت (عالمِ ذرّ) میں داخل ہوگئے تھے (۱۱/۲۸، ۲۲/۲۷) وہ سب کے سب ہر طرح سے سلامت رہے، چونکہ اللہ تعالیٰ کی اس پرحکمت اور خزائنِ اسرار سے مملوٗ سُنّت و عادت میں کوئی تبدیلی رونما ہونے والی نہیں تھی (۱/۲۷، ۳۳/۶۲) لہٰذا خدائے علیم و حکیم بقانونِ روح و روحانیت اپنی یہی عادت ہر دور اور ہر زمانے میں دہرا رہا ہے، اور کوئی وقت اس قانونِ خداوندی سے مستثنیٰ نہیں۔

۶ــــ جب قرآنِ کریم کی ہر آیت بموجبِ ارشادِ نبوی ایک ظاہر اور ایک باطن کے بغیر ممکن ہی نہیں، تو پھر جن آیاتِ کریمۂ قرآنی میں ظاہری طوفان کا قصّہ ہے، اُن کے باطن میں روحانی طوفان / قیامت کا تذکرہ کیوں نہ ہو، چنانچہ یہ بات یاد رہے کہ ظاہری مثال باطنی ممثول کے لئے حجاب کا کام دیتی ہے، تاکہ جتنے بھی عظیم اسرار سربستہ ہیں، وہ سب کے سب صیغۂ راز ہی میں بیان ہوسکیں، الغرض قرآنِ مجید میں جتنی بھی سرکش و نافرمان قوموں کی تباہی و بربادی کا ذکر آیا ہے، اگرچہ ان کی ہلاکت کی ظاہری

مثالیں مختلف ہیں، لیکن باطن میں اُن سب پر ایک ہی عذاب نازل ہُوا، اور وہ روحانی قیامت کا عذاب تھا۔

۷۔ خلیفۂ خدا، خواہ کوئی پیغمبر ہو یا امام، کس معنی[1] میں چہرۂ خدا ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اُن مبارک و مقدّس ہستیوں کا بابرکت دیدار حضرتِ ربِّ کریم کے دیدار کا نمائندہ ہے، ان کی نورانی معرفت میں توحیدِ باری تعالیٰ کی معرفت پنہان ہے، وہ سفینۂ نوح کی طرح وسیلۂ نجات ہیں، ان کا وجود کلامِ الٰہی کا ترجمان ہے، جیسا کہ حدیثِ قدسی کا ارشاد ہے، نورِ خداوندی ان کے لئے حواسِ ظاہر و باطن کا کام کرتا ہے[1] اور جو لوگ اُن میں فنا ہو جاتے ہیں، اُن کے لئے مرتبۂ فنافی اللہ یقینی ہو جاتا ہے۔

۸۔ سورۂ قصص کی آخری آیت (۲۸/۸۸) میں فرمایا گیا ہے: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۔ اس کے چہرۂ پاک (یعنی مظہرِ نور) کے سوا ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے۔ اور اس فنا کی ایک خاص تعریف یہ ہے کہ جب انسانِ کامل (پیغمبر اور امام) کی روحانی قیامت برپا ہو جاتی ہے، تو اُس وقت جماد، نبات، حیوان، اور انسان

---

[1] صحیح بخاری، جلدِ سوم، کتابِ رقاق باب ۸۴۴، حدیث ۱۴۲۲

[2] قیامت اور فنا کیلئے صورِ اسرافیلؑ کا ہونا لازمی ہے۔

جیسی تمام چیزوں کے ذرّاتِ لطیف شخصِ کامل کے عالمِ شخصیت میں داخل ہو جاتے ہیں، جیسے حضرت نوحؑ کے بارے میں ذکر ہوا ہے، اور وہاں، اس دَوران عالمِ شخصی میں مسلسل صورِ اسرافیلؑ بجتا رہتا ہے[۲] اور ہر چیز یہاں غیر شعوری طور پر نمائندۂ چہرۂ خدا میں فنا ہو جاتی ہے، مگر وہ کامل انسان جو عظیم المرتبت ہے، ان ذرّوں کی طرح فنا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اگرچہ جسمانی اعتبار سے فنا پذیر اشیاءٔ میں شامل ہے، لیکن نورانی مرتبت کے لحاظ سے ان سے بدرجۂ انتہا اعلیٰ اور پروردگارِ عالم سے اقرب و واصل ہے۔

۹۔ مذکورۂ بالا بیان غیر شعوری فنا یا ہلاکت کے بارے میں ہے، اب شعوری اور نورانی فنا کے باب میں کچھ عرض کی جاتی ہے کہ ہر پیغمبر اور ہر امام شروع شروع میں اپنے مقدّم کی نورانیت میں فنا ہو کر چہرۂ خدا ہونے کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے، آپ سورۂ رحمان (۵۵/۲۴–۲۸) میں غور کریں، صوفی حضرات کا جو نظریّۂ فنا ہے، وہ یہی ہے، یعنی فنا فی الشّیخ، یا فنا فی المرشد، فنا فی الرّسولؐ، اور فنا فی اللّٰہ، مگر ہمارے یہاں امامِ زمانؑ ہی کامل اور حقیقی مُرشد ہیں، پس اگرچہ نورانی فنا کے درجات تین ہیں، لیکن وہ ایک ساتھ ہیں۔

۱۰۔ آنحضرت صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی بنیادی

سُنّتِ مُطہّرہ یہ تھی، کہ آپؐ اپنی جس نورانیت، اور علم وحکمت کی طرف لوگوں کو مدعو کیا کرتے تھے، اس کے لئے مولا علی علیہ السّلام کو دروازہ قرار دیتے تھے، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ خدا تعالیٰ کا دروازہ پیغمبرؐ ہیں اور پیغمبرؐ کا دروازہ امامِ زمانعؑ، کیوں کہ ہر چیز کا ایک دروازہ ہُوا کرتا ہے، پس اس کا مطلب یہ ہُوا کہ جو شخص بحقیقت امامِ زمان صلوات اللہ علیہ کے در سے داخل ہو جاتا ہے، اس کے لئے خدا و رسولؐ کے جملہ خزانے کھُل جاتے ہیں، اور انہی خزانوں میں گنجِ حقائقِ ازل بھی ہوتا ہے، سو لوگوں کے لئے امامِ عالی مقامعؑ کی فرمانبرداری سب سے بڑی سعادت ہے۔

۱۱۔ یہ اِنتہائی عالیشان مرتبہ، جس کو چہرۂ پُرنورِ خدا یا صورتِ رحمان کہا گیا ہے، وہ آج سے نہیں، بلکہ ازل سے ہے، یعنی ہمیشہ موجود ہے، مگر مقامِ ازل پر اس کا دُوسرا نام کیا تھا؟ اس ازلی اور ابدی حقیقت کا دوسرا نام "نفسِ واحدہ" ہے، ویسے تو اس نور کے بہت سے اسماء ہیں، مگر ہم یہاں اسی نام سے آیاتِ قرآنی کا بیان پیش کریں گے، چنانچہ سورۂ اَنْعَام (۶/۹۸) میں جس شان سے ارشاد ہُوا ہے، اس کی حکمت اس طرح ہے: اور وہ وہی خدا ہے جس نے تم لوگوں کو عالمِ روحانی میں اور مقامِ ازل پر نفسِ واحدہ (ایک شخص) سے پیدا کیا، پھر اُس حکیمِ مطلق نے اپنی رحمتِ بے پایان سے قانونِ

دوئی کو بنایا (۳۶/۳۶ ، ۵۱/۴۹) اور سب کے لئے دو دو انائیں مقرر کی گئیں، ایک انا بحکمِ خُدا مستقر کے نام سے ازلی اور ابداعی حالت میں وہاں رہی، اور دوسری انا بنامِ مستودع اس دُنیا کے میدانِ امتحان میں وارد ہوئی، پس وہ اصل ہے اور یہ اس کا سایہ۔

۱۲۔۔۔ سوال : کیا یہ آدم وحوّا کا قصہ نہیں ؟ آیا ہم ان کی اولاد نہیں ہیں ؟ فردِ واحد یا نفسِ واحدہ سے بہت سے نفوس کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں ؟ **جواب** : یہ ظاہری اور جسمانی آدم وحوّا اور ان کی بدنی اولاد سے پہلے کی بات ہے ، تاہم اگر آپ نفسِ واحدہ کو آدمِ معنی یا آدمِ روحانی کہیں ، تو ہرگز غلط نہ ہوگا ، نفسِ واحدہ سے نفوسِ خلائق پیدا کئے جانے کی دو روشن مثالیں موجود ہیں ، ایک یہ ہے کہ نفسِ واحدہ ، جو چہرۂ خدا بھی ہے ، اور صورتِ رحمان بھی ، اس کی بے شمار جیتی جاگتی تصویریں بنائی گئیں ، دوسری مثال یہ ہے کہ اس کو ابداعی قالب (سانچا) بنا کر اسمیں ھَیُولائے نوں ڈھالا گیا ، اور اس کی اتنی ساری کاپیاں ہوئیں ، جتنے کہ سب انسان ہیں ، ان دونوں مثالوں میں صرف الفاظ کا فرق ہے ، مگر حقیقت میں کوئی فرق نہیں ۔

۱۳۔۔۔ قرآنِ حکیم کے تمام الفاظ میزانِ حکمت میں تُل کر آئے ہیں ، چنانچہ لفظ واحِدہ فاعِلہ کے وزن پر ہے ، لہٰذا نفسِ واحدہ فعلِ

توحید کا فاعل ہے، کہ یہ نفوس کو اپنے ساتھ ایک کر لیتا ہے، کیونکہ ازل میں سب کے سب اس کے ساتھ ایک تھے، اور قادرِ مطلق نے یہ کام اس کے لئے آسان بنا دیا ہے، چنانچہ جو لوگ اسلامی تعلیمات سے مطابق تزکیۂ نفس کا عمل انجام دیتے ہیں، وہ صرف کل ہی نہیں، بلکہ آج دُنیا میں بھی نفسِ واحدہ سے واصل ہو سکتے ہیں، اگر کُلّی طور پر نہیں، تو جُزوی طور پر، اور عملی طور پر نہیں، تو علمی طور پر، پس اس سلسلے میں قرآنی حکمتوں میں غور و فکر، اور عرفانی بھیدوں کی تلاش بہت بڑی عبادت ہے۔

۱۴۔ وہ سب سے بڑے مقام، جہاں آدم و آدمی کی تخلیق ہوتی ہے، دو ہیں، عالمِ امر اور عالمِ خلق، عالمِ امر میں انسانوں کی جیسی پیدائش ہوتی ہے، وہ تولید نہیں، بلکہ اِبداع ہے، جو کلمۂ کُنؔ سے ظہور پذیر ہوتی ہے، لہٰذا وہاں انسان کی والدہ ہے نہیں، اور جہاں تک باپ کا تعلق ہے، وہ بھی ایک اعتبار سے ہوتا ہے، اور دوسرے لحاظ سے نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ انسانوں کی امری پیدائش نفسِ واحدہ سے ہوئی، جس کی مثال اس دنیا میں وہ لاتعداد جراثیمِ حیات ہیں، جو ایک جوان مرد کے وجود میں پائے جاتے ہیں، حالانکہ ان کی ماں ہنوز پردۂ غیب میں ہے، اسی طرح عالمِ ذرّ اور مقامِ عقل پر لوگ موجود تھے، پھر وہ عالمِ خلق میں آدم و حوّا سے جسمانی طور پر بھی پیدا ہو گئے۔

۱۵۔ جیسا کہ سورۂ اعراف (۷/۱۸۹) میں ارشاد ہے: ھوالذی خلقکم من نفسٍ واحدۃٍ وّجعل منھا زوجھا لیسکن الیھا (۷/۱۸۹) وہ خدا ہی تو ہے جس نے تم کو (عالمِ امر میں) ایک شخص سے پیدا کیا اور (عالمِ خلق میں) اس سے اس کا جوڑا بھی بنا ڈالا، تاکہ اس سے تسلی ہو[1]۔ یہاں ایک اور سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے بی بی حوّا کس طرح پیدا ہوئی؟ آپ آیۂ بالا میں غور کر سکتے ہیں کہ ایک لفظ خَلَقَ ہے، اور دوسرا جَعَلَ، اور ان دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے، آخر یہ فرق کیوں؟ اس لئے کہ لفظِ اوّل تخلیق کے لئے ہے، اور لفظِ دُوُم میں تقرّر کے معنی ہیں، اور اگر یہ بات نہ ہوتی، اور پہلوئے آدمؑ سے حوّا کا جسمانی وجود بن جاتا، تو یہی امر قانونِ فطرت بن جاتا، اور آج ہر عورت اپنے والدین سے نہیں، بلکہ اپنے شوہر سے جنم لیتی، مگر یہ بات نہیں، حقیقت کچھ اور ہے، وہ یہ کہ کوئی مرد شوہر نہیں کہلا سکتا، جب تک کہ اس کی بیوی نہ ہو، اور کوئی عورت بیوی نہیں بن سکتی، تاوقتیکہ اس کا شوہر نہ ہو، پس جس طرح بیوی کی حیثیت شوہر سے بنتی ہے، اسی طرح شوہر کی یہ اضافی قدریں،

---

[1] حضرت آدمؑ کو اس اہتمام سے تسکین ہوئی کہ اس سے دُنیا میں سِلسلۂ نور جاری و باقی رہنے والا تھا۔ (۷/۱۸۹)

اور معنویت بیوی سے حاصل آتی ہے، لہٰذا ان کا تقرر یکطرفہ نہیں، بلکہ دوطرفہ ہوتا ہے اور اس میں روحانی میاں بیوی کی مثال بھی ہے۔

۱۶۔ سوال: انائے مُستقر اور انائے مستودَع میں کیا حکمت ہے؟ اِس دوئی میں کیا راز ہے؟ آیا یہ روح کے دو[۲] سِرے ہیں؟ ہم اِس حقیقت کو کِن مثالوں کے ذریعہ سمجھ سکتے ہیں؟ آپ اس کی مزید وضاحت کریں۔ جواب: الف: قرآنِ پاک کا اشارہ ہے کہ ہر چیز کا سایہ ہُوا کرتا ہے (۱۶/۸۱، ۲۵/۴۵) پس انسان کی انائے عُلوی گویا ایک آفتاب ہے، اور انائے سِفلی اس کا سایہ، یعنی عکس ہے۔ ب: قرآنی حکمت کا کہنا ہے کہ روح دراصل کوئی ایسی چیز نہیں، جو محدود ہو، بلکہ وہ ایک ہمہ رس وہمہ گیر حقیقت ہے، لہٰذا اسے بیک وقت دونوں جہان میں ہونا چاہیئے۔ ج: انبیاء و اولیا (ائمہّ) انہی دو اناؤں کی وجہ سے عالمِ روحانی کو بھی دیکھتے ہیں، اور اِس دُنیا کو بھی، اور ان کی یہ صفت اس حقیقت کی دلیل ہے کہ ہر شخص کی دو انائیں ہُوا کرتی ہیں۔ د: مکان ہو تو آنا جانا ہوتا ہے، لامکان ہو تو ایسا نہیں ہوتا، روح اگرچہ لامکانی ہے، تاہم مثال کے طور پر یہ کہنا جائز ہے کہ یہ انا اوپر جا سکتی ہے، اور وہ انا نیچے آسکتی ہے، تاکہ دونوں ایک ہو جائیں[۱]

۱: قرآن میں روح اور فرشتوں کے عروج و نزول کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، مثال کے طور پر دیکھئے: ۳۵/۱۰، ۷/۴، ۵۳/۷، ۱۵/۱۴، ۹۷/۴، ۵۸/۲۲، ۴۲/۵۲

۱۷۔ اگرچہ قرآنِ مجید کی ہر ہر آیت آسمانی علم وحکمت کے لعل وگوہر سے لبریز ہے، تاہم آیئے ایک انتہائی حیرت انگیز بھید کو دیکھتے ہیں، جو عظمتِ انسانی کے سب سے بڑے خزانے سے متعلق ہے، اس مبارک ومقدّس ارشاد میں سب سے پہلے تو یہ فرمایا جاتا ہے کہ مومنین خدا اور رسولؐ کی خصوصی دعوت کو قبول کریں، تاکہ وہ روحانی زندگی میں زندہ ہو جائیں، پھر ان کو علم وعرفان کی روشنی میں یہ جاننا ہوگا کہ خدائے علیم وحکیم برائے امتحان وآزمائش کس طرح آدمی اور اسکے قلب کے درمیان حائل ہو گیا ہے، یعنی حقیقی قلب کسے کہتے ہیں؟ وہ کہاں ہے؟ اور اس کا مرتبہ کیا ہے؟ یہ تمام اسرارِ پنہانی اُس وقت منکشف ہوں گے، جبکہ کوئی مومن عالمِ شخصی میں اپنے پروردگار کو پہچانتا ہو، یاد رہے کہ اِس قلب سے امامِ زمانؑ مراد ہے، جو مومن کی انائے عُلوی بھی ہے (۸/۲۴)

۱۸۔ جب کسی خوش نصیب اور کامیاب مومن کو خدا، رسولؐ، اور امامِ وقتؑ کی حقیقی فرمانبرداری کے نتیجے میں روحانیت کا سب سے بڑا دیدار حاصل ہو جاتا ہے، تو وہ شاہنشاہِ دیدار کون ہوتا ہے؟ خدا؟ رسولؐ؟ امامؑ؟ فرشتۂ عظیم؟ اپنی روح؟ انائے عُلوی؟ کتابِ ناطق؟ ازل یا دہر؟ ایک یا سب؟ اِبداع یا اِنبعاث؟ اوّل یا آخر؟ بتایئے کہ وہ کون ہے، جو دیدار دے رہا ہے؟ واللہ!

وہ سب کچھ ہے، اور صوفیوں کی زبان میں "ہمہ اوست"، اسی کو کہتے ہیں، چہرۂ خدا کی روشنی یہی ہے، جس میں تمام حقیقتیں یکجا نظر آتی ہیں بلکہ سب کی ایک ہی حقیقت ہو جاتی ہے، جو حقیقتِ حقائق کے نام سے ہے، اور یک حقیقت بھی یہی ہے۔

۱۹__ دُنیا کی کوئی چیز اِشاراتی زبان سے کچھ کہے بغیر نہیں رہتی چنانچہ جب دو آدمی روبرو ہو جاتے ہیں، تو اُس حال میں وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں نظر آتے ہیں، یہ آنکھ کی پُتلی ہے، جو بزبانِ اشارہ کہہ رہی ہے کہ جب روحانی دیدار ہوتا ہے، تب انائے عُلوی اور انائے سفلی ایک دوسرے میں داخل و شامل ہو جاتی ہیں۔

نوٹ: یہ مضمون ازبس ضروری ہے، اسے خاص توجہ سے پڑھیں، اور بار بار پڑھ کر اس کی گہرائیوں کو سمجھنے کیلئے سعیٔ بلیغ کریں۔

نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی
لنڈن
۱۱/۱۲/۸۶

حجاب اور مظہر[1]

۱۔۔۔ اِس صحیفۂ کائنات اور کتابِ موجودات میں اگرچہ صرف ایک ہی قانون کی بالادستی اور کارفرمائی ہے اور وہ قانونِ قدرت یا نظامِ فطرت کہلاتا ہے، لیکن یقیناً اسی کی مختلف شکلیں یا جدا جدا ظہورات مانیئے کہ اس عالمِ کثرت کے کارخانۂ بوقلمونی اور رنگارنگی میں بہت سے قوانین باہم مل کر کام کر رہے ہیں، جن میں انتہائی اہمیت کے ساتھ دستورِ حجاب بھی ہے، اور آئینِ مظہریّت بھی، لیکن جہاں یہ دونوں قانون خداوند تعالیٰ کے لئے خاص ہیں، تو وہاں سے یہ اپنے دامنِ مقدّس میں دین و دنیا کی جملہ سعادتیں اور برکتیں سمیٹ کر اور علمِ الٰہی کی حسین و جمیل تجلّیات کا سرچشمہ بن کر آتے ہیں، پس اُن لوگوں کی سب سے بڑی سعادتمندی ہے، جو اِس خدائی حجاب و مظہر کو کعبۂ جان اور قبلۂ ایمان سمجھے ہیں۔

۲۔۔۔ نورِ مطلق خود حجاب بھی ہے، اپنے آپ میں محجوب (پوشیدہ)

[1]: حجاب، پردہ، مظہر، جائے ظہور، ظاہر ہونے کی جگہ۔

بھی، مظہر بھی ہے، ظاہر بھی، عاشق بھی ہے، اور معشوق بھی، اِس حقیقت کی ایک روشن مثال سورج ہے کہ وہ مادیت میں سب کچھ ہے، چنانچہ موسمِ سرما خورشیدِ جہان آرا کی تمازت وحرارت سے دُوری اور اس کی کمی کا نام ہے، جس میں زمین ایک بار مرجاتی ہے، لیکن نورِ آفتاب کا یہ کتنا بڑا کارنامہ اور کیسا احسانِ عظیم ہے کہ بہارِ رفتہ کو واپس لاتے ہوئے زمینِ مُردہ کو ازسرِ نَو زندہ کر دیتا ہے، حجابِ خاک سے نباتات کی عُروُسانِ سبز پوش کو نمایاں کرکے ان کے جلوہ ہائے حُسنِ زُمُرّدین[1] دکھلاتا ہے، اب غنچہ ہائے چمن کے بارے میں سُن لیجئے کہ وہ نہ صرف خوبصورت پھولوں کے حجابات ہی ہیں، بلکہ ان دل آویز گلُوں کے مظاہر بھی ہیں، پس نیّرِ اعظم نے نسیمِ بہار کو ایک معتدل مزاج عطا کرتے ہوئے کہا کہ اب تم گلستان کی تمام کلیوں کو گدُ گدُا کر ہنسا دو، تاکہ رنگ برنگ پھول جو شہکارِ قدرت ہیں وہ پردۂ خلوت سے جلوت میں آئیں، اور بیدریغ رنگ وبُو کی دولت لُٹا دیں، اور یہ نورِ شمس ہی تو ہے، کہ طیورِ خوش الحان کو پھر سے باغ وچمن کی بزمِ موسیقی کے لئے مدعو کرتا ہے، جو شدّتِ سردی کی وجہ سے نگاہوں سے غائب اور محجوب ہو گئے تھے۔

---

[1] زمرّدین، سبز رنگ کا، زمرّد کی طرح سبز۔

۳۔۔۔ غنچہ اگر حجابِ گُل ہے، تو گُل میوۂ خام کا پردہ ہے، خام و ناتمام میوے ہی میں پختہ و تمام ثمر تیار ہو جاتا ہے، جس میں گٹھلی مخفی ہوتی ہے، اس میں مغز پوشیدہ رہتا ہے، جس کے اندر تیل، اور تیل روشنی کا حجاب بھی ہے، اور مظہر بھی، یہ سارا قصہ کیا ہے؟ حجاب در حجاب کی ایک خوبصورت مثال ہے، نیز پہاڑ کے بارے میں ذرا غور کیجئے، کہ اس کی ساخت کس طرح تہ بہ تہ ہوتی ہے، اور اِن تہوں کے بہت سے پردوں کے پیچھے بیش بہا جواہر پنہان ہوتے ہیں، سمندر کے گوہر ہائے گرانمایہ پُر خطر حجابات کے بغیر کہاں حاصل ہو سکتے ہیں، غرض دنیا کی کوئی چیز، خواہ گرانمایہ ہو یا کم مایہ، حجاب کے بغیر نہیں، جی ہاں، حجابات کئی طرح کے ہُوا کرتے ہیں، مثلاً مادی اشیاء کا درمیان میں حائل ہو جانا، زمان یا مکان کی مسافتیں، ہر قسم کی رکاوٹیں، مشکلات، لاعلمی، غفلت، ناشکری، جہالت، وغیرہ۔

۴۔۔۔ آپ سورۂ شوریٰ ($\frac{42}{51}$) کی تہ بہ تہ حکمتوں میں بنظرِ غائر دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں کہ خداوندِ دو جہان کا نہ صرف حجاب ہی ہے، بلکہ مظہر و ظہور بھی ہے، اور اس کے حجابِ اکبر کے لئے بہت سے حجابات بھی ہیں، اور یہ قانون یاد رہے کہ حجابِ اعظم ہی ہے جو مظہریت کا مقدس ترین فریضہ بھی انجام دیتا ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جاننا ہے کہ خدا نور ہے، لہٰذا نورِ اقدس کا حجابِ متصل یعنی حجابِ اکبر کوئی اور چیز نہیں، بلکہ

صرف نور ہی ہوسکتا ہے، جیسے سورج مادّی نور ہے، اور اس کا بیرونی حصّہ اندرونی حصّے کا پردہ و نمائندہ ہے، اس کے سوا اس مادّی دنیا میں کوئی ایسی انتہائی طاقتور چیز ہے ہی نہیں، جو آفتاب جہانتاب کی قیامت خیز نوری امواج کے بالکل سامنے ٹھہر کر حجاب مُتّصِل یا خول کا کام کرسکے۔

۵۔ مُحوّلۂ بالا آیۂ کریمہ میں جملہ روحانیّت کے تین مدارج کا تذکرہ فرمایا گیا ہے، ان میں سب سے اعلیٰ درجہ ظہور نورانی، رُویت، مشاہدہ، اور اشاراتِ جوامع سے متعلق ہے، جس میں ابداع و انبعاث، ازل و ابد، اور دوسرے تمام انتہائی عظیم معجزات شامل ہیں، دوسرا درجہ وہ ہے، جس کے معجزے حجاب کے پیچھے سے سنائی دیتے ہیں، اور تیسرا درجہ جو سب سے نیچے ہے، اِس میں ارواح و ملائکہ کے سارے عجائب و غرائب کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

۶۔ اب سے تقریباً چودہ ۱۴۰۰ سو سال قبل نزولِ قرآن کے دَوران مستقبل کے ظاہری و باطنی انقلابات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا تھا کہ آگے چل کر قرآنِ کریم کی تاویل آنے والی ہے (۷/۵۲-۵۳) اس کا مطلب یہ ہُوا کہ قرآنی تاویل جو پہلے چند اعلیٰ درجات کے لئے خاص تھی، وہ سب کے لئے عام ہو جائے گی، چنانچہ اس بارے میں میرا پُختہ یقین یہی ہے کہ جس طرح عصرِ حاضر میں مادّی

ترقیوں کا ایک بہت بڑا طوفان آیا ہے، اسی طرح روحانیت میں بھی ایک عظیم انقلاب آچکا ہے، اور وہی تاویل ہے، اب آپ خود سورۂ اعراف کی آیت ۵۲ - ۵۳ میں بغور دیکھ کر بتائیں کہ ہمیں اس معاملے میں کیا کرنا چاہیئے، آپ البتہ یہی کہیں گے کہ تاویل جب بھی ہو اور جہاں بھی ہو، حکمت اور خیرِ کثیر ہے (۲/۲۶۹) لہٰذا بڑی قدردانی سے اسے قبول کرنا چاہیئے، تاکہ قرآن اور اسلام کی لازوال عظمتوں کا ثبوت ہو۔

۷۔۔۔ اللہ جلّ جلالہٗ نے سورۂ نور (۲۴/۳۵) میں جس شانِ علم و حکمت سے اپنے نورِ پاک کی تشبیہہ و تمثیل بیان فرمائی ہے، اس میں عرفان و ایقان کی ایک روشن دنیا موجود ہے، اور وہاں یہی قانونِ حجاب و مظہریّت دوسرے بہت سے حقائق کے ساتھ درخشان ہے، وہ یہ کہ چراغِ نور "زُجاجہ" (شیشے کی قندیل) میں ہے، آیا یہ زجاجہ یا شیشہ بھی نور نہیں ہے، تاکہ نور کا پردہ اور مظہر بھی نورانیّت سے بھرپور ہو؟ یقیناً ایسا ہی ہے، کیونکہ وہ شیشہ مادیّت کی کوئی بیجان و بیعقل چیز تو نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ ایک مبارک و مقدس ہستی ہے، کوئی شک نہیں کہ وہ انسانِ کامل ہے، جب اسے نورِ انوار کے قرب و اتّصال کا یہ بلند ترین مرتبہ حاصل ہے، تو اس کو خود بخود نور ہو جانا اور ہمیشہ روشن رہنا ہے۔

۸۔۔۔ میرے بہت ہی عزیز دوستو! کیا آپ نے کبھی نورِ علیؑ

نور (۲۴/۳۵) کے بارے میں گہرائی سے سوچا ہے؟ کیونکہ اس میں بڑے بڑے بھید ہیں، مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: الف : نُورٌ عَلٰی نُور (ایک نور کے بعد دوسرا نور ہوتا رہتا ہے) یعنی انبیاء و آئمہؑ علیہم السلام، جو اپنے اپنے زمانے میں نورِ خدا کے مظاہر اور انوار تھے، جبکہ اللہ نور الانوار ہے اور بحکمِ نورٌ علیٰ نور ہادیٔ زمان میں انوار کی وحدت ہوتی ہے۔ ب : اپنے خیال کی تختی پر عددِ واحد (۱) لکھئے، اب بالکل اسی شکل کے اوپر یہی ایک کا عدد ہزار بار تحریر کریں، پھر تصوّر میں دیکھیں، کہاں ہے وہ ہزار کا ہندسہ؟ کچھ نہیں بس صرف ایک ہی ہے، یہ نورٌ علیٰ نور کی وحدت ہے۔ ج : نور کے چار درجات ہیں: نورِ الُوہیّت (۲۴/۳۵) نورِ نبوّت (۳۳/۴۶) نورِ امامت (۵۷/۲۸) اور نورِ مومنین (۵۷/۱۲) مگر نورٌ علیٰ نور کا اشارہ یہ ہے کہ تمام انوار ایک ہو جاتے ہیں [1]

۹۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس درخت سے نورِ خدا کو دیکھا تھا، وہ درخت درحقیقت کیا تھا؟ مظہر اور حجاب کا وجودِ مبارک، یعنی حضرت موسیٰؑ کا عالمِ شخصی نیز امامؑ کی پاکیزہ شخصیت کیونکہ قرآنِ حکیم کے کئی مقامات پر پیغمبر اور امام کی تمثیل درخت سے دی گئی ہے۔ اس لئے کہ اُن کی پاک و پاکیزہ ہستی وہ شجرۂ طیبہ ہے، جس کا ذکر سورۂ ابراہیم

---

[1] جیسے فنا فی اللہ اور بقا باللہ کا تصوّر ہے۔

(۱۴/۲۵-۲۴) میں فرمایا گیا ہے، یہ بہشتِ روحانیت کا سدا بہار درخت ہے، جو ہر وقت اپنے پروردگار کے حکم سے پھل دیتا رہتا ہے۔

۱۰۔ سوال: حجاب کا سایہ کس پر پڑتا ہے؟ آیا یہ حجاب بصری ہے، یا سمعی؟ یا دونوں ہیں؟ سورۂ شوریٰ (۴۲/۵۱) میں کس قسم کے حجاب کا ذکر ہے؟ جواب: حجاب کا سایہ نور پر نہیں، بلکہ نافرمان انسانوں پر پڑتا ہے، زمین اور بادلوں کے سایے سورج پر نہیں، بلکہ اہلِ دُنیا پر پڑ جاتے ہیں، کیونکہ کوئی ظاہری اور مادّی تاریکی سورج کی طرف نہیں جا سکتی ہے، ہاں، حواسِ ظاہر و باطن میں سے ہر حس کے لئے ایک حجاب ہُوا کرتا ہے، سورۂ شوریٰ میں بصری حجاب کا تذکرہ ہے، کیونکہ اُس درجے سے اوپر رُویت و دیدار کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

۱۱۔ سورۂ معارج (۷۰) کی ۹ ابتدائی آیاتِ مبارکہ پیشِ نظر رکھیں، اور سب سے پہلے لفظِ معارج کو لیجئے، جس کے معنی ہیں سیڑھیاں، درجے، واحد معراج، اللہ تعالیٰ شانہٗ کو "ذی المعارج" (درجوں والا) اس لئے کہا گیا کہ اس کی بارگاہِ قرب تک پہنچنے کے لئے انسانوں اور فرشتوں کو بہت سے درجات طے کرنے پڑتے ہیں (قاموس القرآن) یہاں جیسے ارشاد ہُوا ہے، اس کے مطابق ایک جانب کوئی دن ہے، اور دوسری جانب پچاس ہزار (۵۰،۰۰۰) برس ہیں، اور سیڑھیوں کے اشارے سے یقین ہو گیا کہ یہی پچاس ہزار برس دوسری مثال میں پچاس

ہزار درجات و حجابات بھی ہیں، جن سے گزرے بغیر خدا کے حضورِ خاص تک نہ کوئی بشر پہنچ سکتا ہے اور نہ کوئی فرشتہ، لیکن قرآنی حکمت کہتی ہے کہ قادرِ مطلق کے ایک ہی دن نے ان پچاس ہزار سالوں کو سمیٹ کر اپنے اندر محدود و مختصر کرلیا ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کا یومُ (۷۰/۴) امامِ زمان علیہ السّلام ہیں، جیسے اُصولِ تاویل کے مطابق چھ ۶ ناطق علیہم السّلام خداوندِ عالم کے چھ ۶ دن ہیں، اور ساتواں دِن حضرت قائم القیامت علیہ السّلام ہیں، آپ کو اِس حقیقت کا علم ہے کہ خدا وہ ہے، جو اپنی قدرتِ کاملہ سے زمان و مکان کی مسافتوں اور وُسعتوں کو لپیٹتا بھی ہے اور پھیلاتا بھی ہے (۲۱/۱۰۴، ۳۹/۶۷، ۳۶/۱۲) جیسے وہ علیم و حکیم بے شمار چیزوں کو ایک (۱) کرکے گنتی کرلیتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا لوگوں کو اور تمام چیزوں کو شمار کرنا یہ ہے کہ وہ اپنے دستِ قدرت سے سب کو لپیٹ کر عددِ واحد (۱) میں ایک کرکے رکھتا ہے (۱۹/۹۴، ۷۲/۲۸)۔

۱۲ـــ امامِ اقدس و اطہر صلوٰت اللہ علیہ ظاہراً حجاب اکبر، اور باطناً آئینۂ خدا ہیں، وہ یوم الآخر اور یوم القیامۃ ہیں، اور قرآنِ مجید میں قیامت سے متعلق جتنے نام ہیں، وہ سب امامِ عالی مقامؑ کے تاویلی اسماء ہیں، جن میں سے ہر ایک اسم متعلّقہ آیۂ کریمہ کے خزانۂ علم و حکمت کے لئے دروازہ، قفل، اور کلید کا کام کرتا ہے، کیونکہ ہر ایسی آیۂ پاک بطورِ خاص اسرارِ قیامت سے مملو ہوتی ہے، آپ کو یقین ہے کہ پیغمبر اکرم ص کا

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

روحانی مرتبہ شہرِ علم اور دارِ حکمت ہے، جہاں قرآن کی روح و روحانیت محفوظ و موجود ہے، جس کا دروازہ، یعنی حجاب و مظہر حضرتِ امام زمانؑ ہیں، اور یہ قرآنی قانون ہرگز بھول نہ جائیں کہ یہی وہ دروازہ ہے، جس سے بحکم خدا کوئی شخص ظاہر سے باطن میں جا سکتا ہے (دیکھئے سورۂ حدید: ۵۷/۱۳) تاکہ روزِ قیامت کسی کو یہ عُذر نہ ہو کہ اس کے زمانے میں کوئی ایسا وسیلہ موجود نہ تھا، جس سے اس کی قرآنی مشکلات اور جدید مسائل کی تحلیل ہو سکے۔

Nasiruddin Nasir Hunzai

London 15-12-86

اسرارِ انبیاء وَ أئمّہ

۱۔۔۔ حضراتِ انبیا و ائمّہ علیہم السّلام کے بیش از بیش خزائنِ اسرار حضرتِ آدمؑ کے زمانے اور قصۂ قرآن میں مخفی ہیں، اور اس امرِ واقعی کا ثبوت یہ ہے کہ ابو البشر سے متعلق ایسے کثیر سوالات ہیں، جو بڑے اہم ہونے کی وجہ سے ان کے جوابات انقلابی نوعیت کے ہو سکتے ہیں، مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:۔

۲۔۔۔ حضرتِ آدم علیہ السّلام کی تخلیقِ جسمانی اور تکمیلِ روحانی کس طرح ہوئی؟ سورۂ رُوم (۳۰: ۳۰) میں کما حقہٗ غور و فکر کر کے بتائیے کہ آیا سُنّتِ الٰہی اور قانونِ فطرت (پیدائش) میں کوئی تغیّر و تبدّل ہو سکتا ہے؟ سیّارۂ زمین کب پیدا ہُوا؟ اس سیّارے پر انسانِ اوّل کہاں سے اور کیسے وارد ہو گیا؟ کیا وہ صرف ایک ہی آدم تھا؟ پھر مختلف برِّاعظموں میں کس طرح اس کی نسل پھیل گئی؟ حضرت آدمؑ کی خلافت کس عالم میں تھی؟ کائنات میں؟ یا عالمِ دین میں؟ یا عالمِ شخصی میں؟ اگر ابو البشر کی

خلافت صرف روئے زمین پر تھی، تو پھر فرشتوں نے ان کو سجدہ کیسے کیا؟ اور ان سے ملکوتی علم وعرفان کس طرح حاصل کر لیا؟ آیا یہ حقیقت ہے کہ شیطان سجدۂ آدمؑ سے منکر ہونے کی وجہ سے اُس علمِ الٰہی سے محروم رہا، جو خلیفۂ خدا کے پاس تھا؟ بتائیے کہ خلافتِ خداوندی دائمی ہوتی ہے، یا ہنگامی؟ اگر خلافت تمام زمانوں پر محیط ہو کر قیامت تک پائی جاتی ہے، تو وضاحت کیجئے کہ وہ کس طرح ہے؟

۳۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک اور ہر صفت قدیم ہے، اُس کا قول و فعل بھی قدیم ہے، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ کسی ابتدا و انتہا کے بغیر ہمیشہ خالق ہے[1]، چنانچہ تصورِ آفرینش ایک ایسے دائرے کی طرح ہے، کہ اسکا کوئی سرا نہیں، جس کی ایک روشن دلیل خود قصۂ آدمؑ میں موجود ہے، کہ آپؑ اس دنیا میں پیدا ہوئے تھے، جیسا کہ قانونِ فطرت ہے (۳۲/۷، ۱۷/۷۱، ۳۰/۳۰) پھر خدا کے حکم سے بہشت میں چلے گئے، پھر دنیا میں آئے، اور پھر جنّت میں داخل ہو گئے، کیا یہ صرف ایک ہی آدم کی بات ہے؟ پھر دو قانون ہو گئے؟ ایک حضرت آدمؑ کے لئے، اور دوسرا باقی سب کیلئے، نہیں ہرگز نہیں، خُدا کی

---

[1] جس طرح خدا ہمیشہ بے شمار لوگوں کو پیدا کرتا ہے، اسی طرح بے حساب دُنیاؤں کو پیدا کرتا ہے (مفہوم: ۳۰/۳۰)

سنّت ایک ہی ہے، جس کے مطابق یقیناً یہ بے شمار آدموں کا قصہ ہے کہ بہشت کے آخری درجے میں پہنچ کر ہر آدم انائے عُلوی کے اعتبار سے تو رہتا ہے، مگر انائے سِفلی کے لحاظ سے اِس دنیا میں آتا ہے۔

۴۔ حضرت آدمؑ قانونِ فطرت کے مطابق پیدا ہو گئے تھے، جس کو سمجھنے کے لئے آیاتِ قرآنی کا حوالہ درج ہو گیا، اور باقی جتنے اسرارِ عظیم کا ذکر فرمایا گیا ہے، وہ ان کی روحانی تخلیق کے بارے میں ہے، وہ بھید سب کے سب جُملہ انبیاء و آئمہ صلوات اللہ علیہم کی روحانی تمامیّت و کمالیّت کے سلسلے میں مشترک ہیں، کیونکہ حضرت آدمؑ کی ساری عظمت و بزرگی اور علم و فضل محض خلافتِ الٰہیّہ کے سبب سے حاصل تھا، لہٰذا جب تک یہ ربّانی منصب لوگوں کے درمیان موجود ہے، تب تک اسے کسی کمی کے بغیر پوری شان سے رہنا ہے، پس سِلسلۂ انبیاء و آئمہ کا ہر عالی مرتبت فرد وارثِ آدمؑ، خلیفۂ زمان، اور خزینۂ علمِ لَدُنّی ہوا کرتا ہے، اور اگر پروردگارِ عالم کی یہ حکمت و مصلحت نہ ہوتی تو فرشتوں کا وہ اعتراض، جو انہوں نے شروع میں کیا تھا (نعوذ باللہ) درست ثابت ہو جاتا، کہ خدا تعالیٰ نے اپنی انتہائی دور رس اور عالمگیر خلافت کا اعلان تو کر دیا، مگر وہ کچھ زمانے کے بعد خاموش ہو گئی، اس کا فائدہ نہ ظاہر میں ہوا، اور نہ باطن میں، لیکن یہ خیال کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

۵۔۔۔سائنسدانوں کے بقول سیارۂ زمین اب سے تقریباً ۴۵۵۰ ملین سال قبل پیدا ہو گیا ہے، یعنی چار ارب پچپن کروڑ (۴۵۵۰۰۰۰۰۰۰) برس پہلے ہماری دُنیا وجود میں آئی تھی، تاہم اس پر آبادی زمان ہائے دراز کے بعد ہوئی ہوگی، انسانِ اوّل محض موجودہ سیارے کی نسبت سے دُنیا میں کس طرح آیا؟ یہ انتہائی مشکل سوال ہے، لیکن قرآنِ حکیم اور آلِ محمدؐ کے امامِ پاکؑ اس لئے موجود ہیں کہ اگر ہم اُن سے پوچھنے کی قابلیت رکھتے ہیں، تو ہم کو بتائیں، چنانچہ ہر کامل انسان اپنے جسمِ لطیف میں ایک عالمِ ذرّ ہوا کرتا ہے، جس میں نوع بنوع چیزوں کے ابتدائی ماں باپ کے ذرّات یعنی تخمہائے ابداعی ہوتے ہیں، جیسے حضرت نوح علیہ السّلام کے روحانی طوفان میں دُنیا کی ہر چیز ہلاک ہو گئی تھی، مگر آپؑ کے عالمِ شخصی میں کُلّ چیزوں کی ہر قسم کے جوڑے (یعنی نر و مادہ) موجود تھے (۲۳/۲۷، ۵۱/۴۹) لہٰذا یہ دُنیا حضرت نوحؑ سے از سرِ نو آباد ہوئی۔

۶۔۔۔انسانِ اوّل جو شروع شروع میں سیارۂ زمین پر وارد ہوا وہ بہشت، عالمِ لطیف، عالمِ امر، یا ایسے سیارے سے آیا، جہاں جسمِ لطیف کی جنّت معمور تھی، وہ ایک عالمِ ذرّ تھا، وہ کائنات و موجودات کا نچوڑ اور خزانۂ الٰہی تھا، اس میں تمام چیزوں کے ابداعی بیج موجود تھے، جس طرح سائنسی مشاہدات و تجربات کے مطابق آدمی خلیات و جراثیم سے بھرا ہوا ہوتا ہے، اسی طرح روحانیّت کا تجربہ کہتا ہے کہ انسانِ کامل عالمِ ذرّ کا

مرتبۂ اعلیٰ رکھتا ہے، جس کے ذرّات کسی سیّارے کی تخلیق، تعمیر، اور ترقی کے لئے ابتدائی بیج بھی ہیں، اور آخری پھل بھی، جس طرح میوۂ درخت میں یہی دو باتیں ہوتی ہیں کہ وہ کسی شجر کا ثمر بھی ہے، اور کسی درخت کو پیدا بھی کر سکتا ہے۔

۷ــ کائنات اور انسانی ذات کے آپس میں ایک زبردست مضبوط اور اٹوٹ ازلی اور ابدی رشتہ موجود ہے، وہ یہ کہ انسان شجرۂ کائنات کا میوۂ گرانمایہ ہے، اور کائنات میوۂ کمالِ انسانیت کے بیج سے اُگایا ہُوا درخت ہے، دوسری مثال میں یہ عالم ایک خاموش آدم ہے، اور آدمی ایک بولتا عالم ہے، اور تیسری مثال میں یہ جہان ایک ایسے مقام کی طرح ہے، جس میں جگہ جگہ زر و گوہر جیسی بیش بہا چیزیں بکھری ہوئی ہیں، اور انسان ایک ایسا خزانہ ہے، جس میں یہ ساری دولت منظّم طور پر جمع کی گئی ہے، پس عالم اور آدم کی وحدت و سالمیت اسی طرح ہے۔

۸ــ آپ نے رفعِ زمان کا مقالہ پڑھا ہوگا، وہ ایک بہت بڑا انقلابی راز ہے[۱]، سورۂ اعراف میں جہاں (۷/۱۷۲) واقعۂ الست کا ذکر ہے، وہاں دیکھئے، اِس آیۂ مقدسہ میں یہ "بنی آدم" کونسے حضرات

---

[۱] واقعۂ الست کا قرآنی ذکر رفعِ زمان کے طور پر ہے، یعنی اس میں انبیاؑ و أئمہ علیہم السّلام کی رُوحانیت و نورانیت کا یکجا ذکر فرمایا گیا ہے، اور زمانے کو درمیان سے اٹھالیا ہے۔

ہیں؟ انبیاؑ و ائمہؑ علیہم السلام، کیونکہ جملہ فضائل و کمالاتِ آدمؑ اُنہی نفوسِ قدسیہ میں موجود ہیں، اور خلافتِ الٰہیہ کے نورانی تاج سے یہی انسانانِ کامل سرفراز ہیں، یہاں یہ بہت ضروری سوال ہے کہ عہدِ الست کب، کن سے، کہاں، اور کس طرح لیا جاتا ہے؟ عرض ہے کہ ہر پیغمبر اور ہر امام کے روحانی انقلاب کے دوران تمام اہلِ زمانہ کو بذریعۂ صورِ اسرافیلؑ عالمِ ذرّ میں حاضر کر لیا جاتا ہے، جبکہ لوگ ذرّاتی شکل میں ہوتے ہیں، اور وہاں پروردگار اُن سب سے اپنی رُبُوبیّت کا اقرار لیتا ہے۔

۹۔ سوال: "واشھدھم علٰی انفسھم" کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ جواب: الف: اور ان کو اپنی ارواح کا مشاہدہ کرایا۔ ب: اور ان کو اپنے آپ پر گواہ بنا دیا۔ ج: اور ان کو اپنی انائے عُلوی کا دیدار کرایا۔ د: اور ان کو چہرۂ خدا میں فنا کر ڈالا، کیونکہ پروردگار کی پرورش کا درجۂ کمال یہی ہے، یہ عارفین تھے۔

۱۰۔ سورۂ نساء کے اُس ارشادِ مُبارک (۵۴/۴) کو پیشِ نظر رکھیں، جس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے آلِ ابراہیمؑ کے پاس کتاب، حکمت، اور ملکِ عظیم موجود ہونے کا ذکر ہے، زمانۂ نبوّت میں آلِ ابراہیمؑ کون سے حضرات مراد تھے؟ اب کون ہیں؟ اور ان کے پاس کس طرح کتاب، حکمت، اور مُلکِ عظیم موجود ہے؟ کسی شک و شبہہ کے بغیر یہ حقیقت ظاہر و عیاں ہے کہ اولادِ ابراہیمؑ سے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اور آنحضرتؐ

کی آل، یعنی أئمۂ طاہرین علیہم السّلام مراد ہیں، اور کتاب یقیناً قرآنِ پاک ہے، حکمت اس کی زندہ روح ہے، جو ہمیشہ مُعلّمِ رّبانی میں پوشیدہ رہتی ہے، اور مُلکِ عظیم مرتبۂ امامت کی دینی اور روحانی سلطنت ہے، اس میں ہوشمندی سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ قرآنِ مقدّس کے کئی مقامات پر حکمت کا ذکر کتاب سے متعلق مگر ایک جُدا شئ کے طور پر کیوں فرمایا گیا ہے، حالانکہ بظاہر حکمت کتاب ہی کے اندر رہتی ہے؟ یہ روحِ روشن ہے ($\frac{42}{52}$) اور نور برائے قرآن ہے ($\frac{5}{15}$، $\frac{7}{157}$، $\frac{57}{28}$) جو رسول کریمؐ کے بعد امامِ برحقؑ کی پیشانیٔ پاک میں ضَو فگن ہے، تاکہ اس کی تائیدی روشنی میں قرآنِ حکیم کی گہری سے گہری حکمتیں بھی اُجاگر ہو جائیں۔

۱۱ــــ جس مملکت کو خداوندِ تعالیٰ نے عظیم کہا ہے، وہ دُنیا کی کوئی بادشاہی ہرگز نہیں، بلکہ روحانیت کی انتہائی بڑی سلطنت ہے، جو خدائے بے نیاز و برتر کی جانب سے ہر زمانے کے امامِ برحق کو عنایت ہوتی رہتی ہے یہ وہی خلافتِ کُبریٰ ہے، جس کا ذکرِ جمیل قصۂ آدم میں فرمایا گیا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے کہ حضرت داؤدؑ خلیفۂ وقت تھے ($\frac{38}{26}$) اور پھر حضرت سلیمانؑ آپ کے وارث ہوئے ($\frac{27}{16}$) اس کا صاف مطلب یہ ہُوا کہ حضرت سلیمانؑ نہ صرف مُلکِ روحانیت کے بادشاہ تھے، بلکہ مرتبۂ خلافت بھی انہی کو حاصل تھا۔

۱۲ــــ آپ یہ قبول کر سکتے ہیں کہ حضرت امامِ زمان علیہ السّلام کی

باطنی اور روحانی سلطنت بہت سے معنوں میں مُلکِ سلیمانؑ کی طرح ہے، مگر یہ بات یاد رہے کہ جناب سلیمانؑ کی اصل بادشاہی روحانیت میں تھی، اور ظاہر میں جو کچھ تھا، وہ حجاب کے طور پر تھا، آپ کو شاید آج یہ تو معلوم ہو گیا کہ امامِ عالی مقامؑ کو کیوں "شاہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اب ایسا ہونا چاہیئے کہ آپ آئینۂ قرآن میں چشمِ بصیرت سے دیکھا کریں کہ اُس سلطانِ روحانیت کے فضل و کمال اور جاہ و جلال کا کیا عالم ہے، جو خلیفۂ خدا بھی ہے، نائبِ رسولؐ بھی، اور امامِ زمان بھی۔

Nasiruddin Nasir Hunzai

London 18-12-86

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

قرآنی علم الاعداد (۱)

صِفر اعداد کی ترتیب میں سب سے پہلے صِفر (ZERO) کا مقام ہے، کیونکہ اگرچہ یہ تنہا کسی مقدار کو ظاہر نہیں کرتا، لیکن ہر مقدار و مسافت کا نقطۂ آغاز یہی صِفر ہوتا ہے، اس نقشے کو دیکھئے: ۰ ۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰ چنانچہ قرآنِ حکیم کے علم الاشارات کے مطابق صفر نیستی (NON - BEING) کی علامت ہے، اور حکمائے دین کے نزدیک نیستی سے اِبداع مراد ہے، کیونکہ وہ ہر چیز سے مجرّد اور اِدراک سے ماوَرا ہے، مگر ارادۂ کلمۂ "کُنْ" سے اس کے ہر گونہ ظہورات و تجلّیات ہوتی رہتی ہیں، اور "ہو جا" فرمانے والا شاہنشاہ جس چیز کو چاہے، وہی شئ سامنے آتی ہے، اب صفر کے بارے میں مزید بحث یہ ہے کہ یہ کس طرح نیست یا ابداع کے بالمقابل ٹھہرا ہوا ہے، اس کے لئے ملاحظہ ہو: وکنتم امواتاً فاحیاکم (۲/۲۸) اور تم بے جان تھے تو اسی نے تم کو زندہ کر دیا۔ یعنی حالتِ ابداع میں تم سب حرکتِ زندگی کے بغیر

خاموش پڑے تھے، جس طرح کوئی صفر جہاں اکیلا ہوتا ہے، تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی، پس اُس نے تم کو زندہ کیا، مثال کے طور پر کسی شخص نے قلم کی نوک سے صفر لکھا (٠) اور اسی کو نیچے کی طرف کھینچ کر ایک بنا دیا (۱) اِبداع کا ایک دوسرا نام قرآنِ حکیم میں غیرِ شئ ہے ($\frac{52}{35}$)

ایک اگرچہ ایک کا اِشارہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کیلئے ہو سکتا ہے، لیکن وہ ایسا ایک ہے کہ اس کی کوئی مثال نہیں، چنانچہ اُس نے نفسِ واحدہ کو پیدا کیا، اور اسی سے سب کو پیدا کیا، وہ اس طرح کہ اِسی شخص میں سب کی اِبداع ہو کر اِنبعاث ہو گیا ($\frac{31}{28}$) تاکہ اس کا عالمِ شخصی ہر طرح سے مکمّل ہو، کیونکہ جو آدمی بہشت میں داخل ہو جاتا ہے، وہ اکیلا نہیں ہوتا، بلکہ اس کے بے شمار ذراتِ روح ساتھ ہوتے ہیں، جن میں لوگوں کی ایک بہت بڑی دُنیا موجود ہوتی ہے، جس طرح جب آپ عالمِ خواب میں جاتے ہیں، تو اکیلا نہیں جا سکتے۔

بِنابریں ایک کا عدد نفسِ واحدہ کی دلیل ہے، کیونکہ وہ سب کو اپنے ساتھ ایک کر لیتا ہے، یہ نفسِ کُلّی ہے، اور آدمِ معنی، نیز ایک مُبدع ہے، اور حضرتِ قائم علیہ السّلام، نیز عقلِ کُلّی ہے، جس میں عالمِ عقول کی وحدت ہے۔

دو قانونِ وحدت کے بعد قانونِ دُوئی (DUALITY) ہے، جیسے

خداوند تعالیٰ نے خود بنایا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم کا فرمانا ہے کہ حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے تمام چیزوں کو جُفت جُفت پیدا کیا ہے اور اِس قانون سے کوئی چیز مُستثنا نہیں (۳۶/۳۶) نیز سُورۂ زُخرُف (۴۳/۱۲) میں ایک پُر حکمت ارشاد کا اِشارہ ہے کہ خدا نے ساری چیزیں دو دو بنائی ہیں اور تمہارے لئے کشتی اور سواری کے چوپائے بھی ظاہری اور باطنی دو دو بنائے ہیں (۴۳/۱۲) پس دو کے معنی عالمِ روحانی میں عقلِ کُلّ اور نفسِ کُلّ ہیں، دَورِ نبوّت میں میں ناطقؑ اور اساسؑ، اور دورِ امامت میں امامؑ اور حجّت، اور ہر ظاہر کے ساتھ ایک باطن ہُوا کرتا ہے۔

تین عالمِ روحانی میں تین بلند ترین درجات ہیں، اور وہ یہ ہیں؛ کلمۂ باری، عقلِ کُلّی، اور نفسِ کُلّی، عالمِ جسمانی میں بھی سب سے بڑے درجے تین ہیں؛ ناطق، اساس، اور امام علیہم السّلام، موجودات تین قسم کی ہیں؛ عقلی، روحانی، اور جسمانی، پس روشنی اور تاریکی بھی تین نوع کی ہے۔

(۳۹/۶ ، ۷۷/۳۰) حضرت زکریا علیہ السّلام نے عالمِ عقل کی تین راتوں میں کمالِ صحت کے باوجود لوگوں سے بات نہ کر سکنے کا معجزہ دیکھا (۱۹/۱۰) جس میں اُن کے لئے بزبانِ حکمت یہ حکم دیا گیا کہ کلمۂ کُن، گوہرِ عقل، اور نفسِ کُلّ، جو خاموش رات کی طرح مخفی ہیں، ان کے اسرار کے بارے میں لوگوں سے گفتگو نہ کریں، اور آپؑ نے اسی مقام پر دوسرا معجزہ یہ دیکھا کہ تین دن تک ماسوائے اشارے کے آپ لوگوں سے بات نہیں کر سکتے تھے، (۳/۴۱)

جس کا مطلب یہ تھا کہ ناطق، اساس، اور امام علیہم السلام جو دن کی طرح ظاہر ہوتے ہیں، اُن کے بارے آپ لوگوں سے اشارہ وکنایہ سے بات کریں۔

چار اصولِ دین چار ہیں: عقلِ کُل، نفسِ کُل، ناطقؐ اور اساسؑ، جن کی طرف چار کا عدد اشارہ کرتا ہے، پروردگارِ عالم نے چار دن میں عالمِ دین کے پہاڑ بنائے، اور ان کو برکتوں اور قوّتوں سے بھر دیا، یہ چار دن حضرت ابراہیمؑ، حضرتِ موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ ہیں اور وہ پہاڑ ان حضرات کے قرآنی قصّے ہیں، جن میں علم وحکمت کی گوناگون برکتیں مخفی ہیں (۴۱:۱۰) سورۂ فاطر کے شروع ہی (۳۵:۱) میں ہے کہ خدائے پاک وبرتر فرشتوں کو اپنا قاصد بناتا ہے، جن کے دو دو تین تین اور چار چار پر ہوا کرتے ہیں (۳۵:۱) اس میں ارواحِ مومنین کے مختلف درجات کا ذکر ہے، جو کثرتِ ذکر وبندگی، حسنِ عمل، اور حقیقی علم سے مُرتّب ہو جاتے ہیں۔

پانچ حدودِ روحانی پانچ ہیں: قلم، لوح، اسرافیل، میکائیل، اور جبرائیل، حدودِ جسمانی بھی پانچ ہیں: ناطق، اساس، امام، حجّت، اور داعی، نیز حواسِ ظاہر وباطن بھی پانچ پانچ ہیں، یاد رہے کہ حدودِ دین میں سے کسی کو روحانی علم مل جانے کی تین مثالیں ہیں: وہ راہِ اسلام میں جہاد کر رہا تھا، اس میں کافروں کو شکست ہوئی، اور بہت سا مالِ غنیمت

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

اس کے ہاتھ آیا، یا اس کو ایک بہت بڑا دفینہ (خزانہ) مل گیا، یا اس نے کہیں جواہر کی کان دریافت کرلی، اب ایسے مال سے خُمس یعنی پانچواں حصّہ نکالنا ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر پانچ حدودِ جسمانی کے دینی مقصد کے لئے استعمال کرنا پڑیگا (۸/۴۱)

چھ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا (۱۰/۳ ، ۱۱/۷) جاننا چاہیئے کہ یہ حکم عالمِ دین اور عالمِ شخصی کے بارے میں خاص ہے کہ چھ ناطق اپنے ادوار سمیت دینی عالم کے چھ دن ہیں، اور پرسنل ورلڈ میں ان کے نمونوں کے طور پر روحانیت کے چھ مراحل ہیں، تاکہ انسان کو اپنی ذات ہی میں خدا اور اس کے عظیم پیغمبروں کی شناخت حاصل ہو، انسانی جسم کی تخلیق کے بھی چھ مرحلے ہیں: سُلالہ، نُطفہ، عَلَقہ، مُضغہ، عِظام، لحم، اور خلقِ آخر میں کمالِ روحانیت کا ذکر ہے، نیز چھ شریعتیں ہیں، اور چھ اطراف ہیں۔

سات سورۂ طلاق کے آخر (۶۵/۱۲) میں قرآن فرماتا ہے کہ: خدا ہی تو ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور انہی کی طرح زمین کو بھی (۶۵/۱۲) بڑے دَور کے دینی آسمان یہ ہیں: حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت محمد مصطفیٰؐ اور حضرت قائمؑ اور سات زمین چھ اساس اور خلیفۂ قائمؑ ہیں، اور چھوٹے

ISW
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

دَور کے سات آسمان ؛ سات أئمہؑ ہیں، اور سات زمین ان کے ابواب ہیں۔

ایک بڑا اہم سوال : روحانیّت کے یہ سات آسمان کس طرح ہیں ؟ کیا وہ مادی چیزوں کی طرح الگ الگ ہیں؟ یا ایک ہوگئے ہیں ؟ اگر وہ ایک ہوگئے ہیں، تو اس کی کیا مثال ہوسکتی ہے ؟ جواب ؛ وہ الگ الگ نہیں، کیونکہ خدا نے ان کو تہ بہ تہ پیدا کیا ہے، ان کی وحدت کی مثال نورٌ علیٰ نور ہے، جس کا ذکر "حجاب اور مظہر" کے موضوع میں ہوچکا ہے، اور یہاں بھی ایک مثال درج ہے، ملاحظہ ہو،

← اِ، اِ، اِ، اِ، اِ، اِ، اِ

یہ عددِ واحد کی سات جدا جدا شکلیں ہیں، ان سب کو تیر کے رُخ آگے لے جاکر آخری شکل پر اس طرح رکھ دیں کہ یہ تہ بہ تہ (طباق ٦٧/٣، ٧١/١٥) ہوکر "ایک" نظر آنے لگیں، جیسے یہ شکل ہے ؛ "اِ" کہ یہ ایک بھی ہے، اور سات بھی، اس کا ایک ہونا ظاہر ہے، مگر سات ہونے کی دلیل چاہیئے، اور وہ دلیل یہ ہے کہ قانونِ وحدت نے سات کو ایک کرلیا ہے، مثال سامنے ہے، اور ہم سب نے دیکھا ہے۔

آٹھ آپ نے مقالے میں پڑھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حجاب سے بھی کام لیتا ہے، چنانچہ خدائے پاک کا یہ ارشاد مثال کے حجاب میں ہے: وانزل لکم مِن الانعام ثمٰنیۃ ازواجٍ (٣٩/٦) اور اسی نے تمہارے

لئے چوپایوں کے آٹھ جوڑے نازل کر دیئے۔ اگر آپ پوری آیۂ کریمہ کے ربط کو دیکھیں، اور لفظِ نازل (یعنی انزل) پر غور کریں، تو یقین کریں گے کہ اس میں حدودِ دین کے خدا کی طرف سے ہونے کا ذکر ہے، یعنی ناطق، اساس، امام، اور حجتِ اعظم کا کام اور مرتبۂ نورانیت ظاہر میں بھی ہے، اور باطن میں بھی، لہذا ان حضرات کے آٹھ جوڑے ہوگئے، سورۂ انعام (٦) آیت ۱۴۲-۱۴۴ دیکھئے، اور کتابِ وجہِ دین کو بھی پڑھیئے۔

سورۂ قَصَص (۲۸/۲۷) کو دیکھئے، حضرت موسیٰؑ نے حضرت شعیبؑ کے ہاں آٹھ یا دس سال تک بکریاں چرانے کی خدمت انجام دی، اور اس کی تاویلی حکمت یہ ہے کہ اُس دوران آپؑ ذرّاتِ روح کی بکریاں بھی چراتے تھے، اب سورۂ کہف (۱۸/۹ تا ۲۶) پیشِ نظر ہو، چنانچہ اصحابِ کہف سات تھے، اور آٹھواں ان کا کُتا تھا، اس کی تاویلی مثال میں یہ انتہائی عظیم راز پوشیدہ ہے کہ امامِ زمان صلوات اللہ علیہ کے نورانی درجات سات ہیں، اور ہر وہ مومن جو خدمت، غلامی، اور وفاداری میں امام کا کُتا ہو، وہ ان درجات کا آٹھواں شمار ہوتا ہے، اسی طرح اصحابِ کہف آٹھ ہوگئے، یہ مومنین کی ذاتی دنیا کی بات ہے کہ اس میں بہت سی زبردست صلاحیتیں خوابیدہ ہیں، جب یہاں روح کُلّی طور پر جاگتی ہے، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ عالمِ شخصی میں سب کچھ موجود ہے،

اگرچہ باور کرنا کوئی آسان کام تو نہیں، آخر میں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ جس مومن کا نام سگِ علی یا کلبِ علی (علی کا کُتّا) ہے تو وہ نام حکمت سے خالی نہیں۔

Nasiruddin Nasir Hunzai
London 21-12-86

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

قرآنی علم الاعداد (۲)

آٹھ بہشت آٹھ ہیں، وہ زندۂ جاوید اور عقل و جان کی اعلیٰ قدروں سے آراستہ ہیں (۲۹/۶۴) وہ جنتیں انبیا و أئمہ علیہم السلام ہیں یعنی چھ ناطق، حضرت قائم، اور حجتِ قائم، نیز سات أئمہ، اور خلافتِ صُغرا دیکھئے سورۂ نور (۲۴/۵۵) اور اس میں خوب غور و فکر کیجئے، نیز اصحابِ کہف اور حاملانِ عرش کے بارے میں بھی سوچ لیجئے، اگر مومن امامِ زمانؑ میں فنا ہو سکتا ہے، تو پھر وہ بفضلِ خدا کیا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بہشت کا کام دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسانِ کامل سے بہتر کوئی مخلوق پیدا نہیں کیا، اور کوئی بھی دانا ایسی جنّت میں جانا نہیں چاہتا، جو عقل و جان کے اَوصافِ کمال سے عاری ہو، اور آدم و آدمی کے دوسری تمام مخلوقات سے اشرف و افضل ہونے اور صورتِ رحمان کا سب سے اعلیٰ مرتبہ رکھنے سے متعلق بہت سے دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں، مثال کے طور ملاحظہ ہو:

الف : ربّ العزت نے چار بار قسم کھا کر فرمایا کہ اس نے انسان کو بہترین تقویم یعنی کھڑا کر دینے اور مرتبۂ اعلیٰ تک پہنچا دینے کے نہج پر پیدا کیا ہے (۹۵/۴-۱) ـــ ب : خدا نے کائنات و موجودات کی ہر گونہ تخلیق و تیاری کے بعد انسان کو پیدا کیا، اور اسے "خلقِ آخر" یعنی درجۂ کمال کی مخلوق قرار دیا، اور اسی مناسبت سے اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا (۲۳/۱۴) ـــ ج : بیشک خدا نے ہر چیز کو خوبصورت بنائی، لیکن آدمی کو ہر طرح کی صلاحیتوں سے ممتاز و سرفراز کر کے اس میں اپنی روح پھونک دی (۳۲/۷-۹) ـــ د : اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کو دوسری جملہ مخلوقات پر جیسی کرامت و فضیلت عنایت کر دی ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ پروردگار نے اس کو پشتِ قدرت پر اٹھا کر ظاہری اور باطنی خشکی اور سمندر کی سیر و سیاحت کرا دی ہے، اور جسم و جان کے لئے پاکیزہ رزق دیا ہے، پس ظاہر ہے کہ بہشت انسانی شکل کی ہے، یعنی ہر کامل انسان بحدِ فعل بہشت ہے، اور دوسرے سب لوگ بحدِ قوّت بہشت ہیں۔

قیامت کے دن حاملانِ عرش آٹھ ہوں گے (۶۹/۱۷) عرش کے معنی یقیناً تخت ہیں، لیکن اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کا تخت نور ہے، چنانچہ امامِ اوّل سے لیکر امامِ ہفتم تک عرش کے اٹھانے والے علی الترتیب سات ہو گئے، اور وہ جملہ مومنین جو نورِ ہدایت سے وابستہ ہیں وہ عالمِ

شخصی میں انفرادی طور پر اور عالمِ دین میں اجتماعی طور پر حاملِ ہشتم کی حیثیت سے اُن حضرات میں شامل ہوں گے (۵۷/۱۲، ۵۷/۱۹، ۶۶/۸) یہاں یہ سرِّ عظیم یاد رہے کہ عرشِ اعلیٰ ہمیشہ حرکت میں ہے، اور اس نورانی حرکت کی بدولت دونوں جہان زندہ ہیں۔

نو | اللہ تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو نو ۹ کھلے معجزے عطا کر دیئے تھے (۱۷/۱۰۱) ان کی تفصیل یہ ہے: عصا، یدِ بیضا (۷/۱۰۸، ۷/۱۰۹) قحط، پھلوں کی کمی (۷/۱۳۰) طوفان، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈک، اور خون (۷/۱۳۳) ان معجزات کے اشارات یہ ہیں: عصا (لاٹھی) سے اسمِ اعظم مراد ہے، یدِ بیضا، مرتبۂ عقل کا مظاہرہ ہے، قحط روحانی علم کا نہ ہونا ہے، پھلوں کی کمی حدودِ دین سے فیض کا نہ ملنا ہے، طوفان روحانی انقلاب ہے، ٹڈیوں کا اشارہ ایسی روحوں کی طرف ہے، جو دینِ حق سے متعلق عقاید کی فصل کو تباہ کر دیتی ہیں، جوؤں سے اذیت ناک روحیں مراد ہیں، مینڈکوں کا عذاب بھی روحانی تھا، جس میں نہ صرف ان کی آوازیں بلکہ شکلیں بھی ستاتی تھیں، صاف ستھرا پانی فرعون اور اس کی قوم کے لئے خون کی شکل میں بدل جاتا تھا، یعنی حضرتِ موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کا پاک و پاکیزہ علم ان کو شکوک و شبہات کا مجموعہ بن جاتا تھا۔

دس | دس جو عددِ کامل ہے (۲/۱۹۶) وہ حضرت ناطق صلی اللہ

علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے ہے، کیونکہ آپؐ حدودِ جسمانی کے درجۂ کمال پر ہیں، اور وہ ترتیب اس طرح ہے: ۱۔ مستجیب، ۲۔ ماذونِ اصغر، ۳۔ ماذونِ اکبر، ۴۔ داعیٔ مکفوف، ۵۔ داعیٔ مطلق، ۶۔ حجّتِ جزیرہ، ۷۔ حجّتِ اعظم، ۸۔ امامؑ، ۹۔ اساسؑ، اور ۱۰۔ ناطقؐ۔

قرآنِ پاک میں ہے کہ: جو شخص نیکی کرے گا تو اس کو ایسی دس نیکیاں ملیں گی (۶/۱۵۹) یعنی جو دعوتِ حق کو قبول کرے، اس کو مذکورۂ بالا دس درجات بطورِ خزانہ ملیں گے، اور یہ حکمت بھی سن لیجئے کہ حدودِ جسمانی دس ہیں، اور مستجیب اس عدد (۱۰) کا دسواں حصّہ ہے، یعنی قرآن کی زبان میں معشار ہے (۳۴/۴۵) پس اللہ تعالیٰ نے ظہورِ اسلام سے پہلے لوگوں کو جو کتاب اور حدود دیئے تھے، وہ اس کے دسویں حصّے کو بھی نہیں پہنچے، یعنی وہ مستجیب نہ بن سکے، اور اسی وجہ سے انہوں نے خدا کے پیغمبروں کو جھٹلایا (مفہوم: ۳۴/۴۵) سورۂ طٰہٰ (۲۰/۱۰۳) میں فرمایا گیا ہے، کہ رُوزِ قیامت مجرمین آپس میں چپکے چپکے کہتے ہوں گے کہ (دُنیا میں) ہم لوگ تو بس دس دن ٹھہرے ہوں گے، اس سے دس حدود کے عوالمِ شخصی مراد ہیں، جو ان میں سب سے زیادہ ہوشیار ہے وہ بول اُٹھیگا کہ تم تو بس ایک دن ٹھہرے ہو گے (۲۰/۱۰۴) چونکہ حضرت ناطق علیہ السّلام جسمانی حدود کا مجموعہ ہیں، اور امامِ موجودؑ آپؐ کا جانشین، لہٰذا اِس اعتبار سے صرف ایک ہی عالمِ شخصی ہے، پس امامِ اطہرؑ کی شخصیت ایک دن کی مثال

ہے، جیساکہ سورۂ روم (۳۰/۵۶) میں ارشاد ہوا ہے کہ لوگ انبعاث تک خدا کی (بولنے والی) کتاب میں رہتے ہیں، یعنی امامِ وقت کے عالمِ شخصی میں بشکلِ ذرّات مقیم ہوتے ہیں۔

گیارہ | حضرت یوسف علیہ السلام نے شروع شروع میں خواب دیکھا تھا کہ گیارہ ستارے اور شمس و قمر آپؑ کو سجدہ کر رہے ہیں، (۱۲/۴) اس کی تاویل یہ ہے کہ اُس وقت آپؑ بھی ایک ستارہ تھے، چُنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے وقت کے امامِ مُستودع تھے، آپؑ کے بارہ فرزند بارہ ستارے، یعنی بارہ حُجّت تھے، ان میں سے ایک ستارے (حضرت یوسفؑ) کو خداوند تعالیٰ نے چاند پھر سورج (یعنی باب اور پھر امام) بنا دیا، اس لئے گیارہ حُجّتوں، سابق امام، اور حُجّتِ اعظم نے اُن کی اطاعت بجالائی، لیکن یہاں چند ضروری سوالات پیدا ہو جاتے ہیں:

الف: آیا اس میں لیلی حُجّتوں کا ذکر ہے؟ یا نہاری حُجّتوں کا؟ یا دونوں کا؟ کیا دُنیا کے بارہ جزائر نہیں ہوتے؟ اور ہر جزیرے میں حدِّ دین؟ — ب: آیا تمام حجتانِ شب و رُوز امام ہی کے گھر سے ہوتے ہیں، جیساکہ قصّۂ یوسفؑ سے ظاہر ہے؟ — ج: حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کب سجدہ کیا؟

جواب: اس میں لیلی اور نہاری دونوں حُجّتوں کا تذکرہ ہے، جی ہاں، سیّارۂ زمین کے بارہ جزیرے ہیں، اور ہر جزیرے پر حدِّ دین

ہُوا کرتے ہیں، وہ جسمِ کثیف میں بھی ہو سکتے ہیں اور جسمِ لطیف میں بھی وارثِ تختِ امامت تو امام کے خاندان سے ہُوا کرتا ہے۔ باقی حدود کیلئے جگہ اور خاندان شرط نہیں، ویسے تو قرآنِ حکیم سراسر احسن القصص ہے، تاہم یہ ارشاد سورۂ یوسفؑ (۱۲/۳) میں ہے، اور یہ اشارہ بھی ہے کہ اس میں حدودِ دین کے نظام اور قانونِ تاویل سے متعلق ہر سوال کے لئے جواب موجود ہے (۱۲/۷) پس ہم یقین کریں گے کہ مرکزِ امامت سے تمام حجتانِ جزائر کو ہر وقت نہیں تو کچھ خاص وقتوں میں روحانی رابطہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قصۂ یوسفؑ میں سب حُجّتوں کو امام سے مربوط کرکے پیش کیا گیا ہے، یعنی ظاہری واقعہ کچھ ایسا لگتا ہے، جیسے یہ سب حضرت یعقوبؑ کے گھر کا معاملہ ہو، مگر یہ بات نہیں، بلکہ دراصل یہ حدودِ دین کا قصہ ہے، جس میں تمام حُجّتوں کی منفی اور مثبت حکمتوں کا یکجا ذکر فرمایا گیا ہے۔

بارہ بنی اسرائیل کے باب میں ارشاد ہے: وبعثنا منھم اثنی عشر نقیبا (۵/۱۲) اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کئے۔ یہاں روحانی اور عرفانی نقطۂ نگاہ سے لفظِ بعث زیادہ سے زیادہ قابلِ توجہ ہے، کیونکہ اسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ حضرات کس عظمت و مرتبت کے سبب سے سردار تھے، چنانچہ بعث کا اصل مطلب اِنبعاث ہے، جو روحانیت کا درجۂ کمال ہے، جہاں ابداع کے معجزات بھی ہیں، اور آپ

نے پڑھا ہے کہ ابداع و انبعاث کیا ہوتا ہے، پس وہ بارہ سردار حضرت موسیٰؑ کے حُجج کرام تھے، اُن میں سب سے پہلے اساسؑ، امامؑ اور باب تھے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے بحکمِ خدا ان نقیبوں میں سے ہر فرد کے سنگِ عقل میں اسمِ اعظم کی لاٹھی مار کر علم و حکمت کا ایک پاک و پاکیزہ اور شیرین چشمہ بہا دیا، اور اسی طرح بارہ حُجتوں کے عوالمِ شخصی میں کُل بارہ چشمے ہو گئے ($\frac{2}{60}$، $\frac{7}{160}$) اس ربّانی تعلیم میں اہلِ دانش کے لئے بہت سی عظیم حکمتیں موجود ہیں، اس لئے آپ یہاں آپس میں اچھی طرح سے مذاکرہ کریں، اور پوچھیں کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں یہ حدود اور یہ چشمے نہیں تھے؟ اور بعد میں بھی؟

جس طرح دنیائے ظاہر کے ایک سال میں بارہ مہینے ہُوا کرتے ہیں، اسی طرح عالمِ دین کا ایک سال بارہ مہینوں کا ہوتا ہے، مگر دین کی ہر چیز حیات و دانش کے بغیر نہیں، اس لئے دین کے مہینے زندہ و گویندہ ہیں، وہ زمانۂ نبوّت کے حُجج ہیں، نیز دَورِ امامت کے حُجّتان ہیں، بارہ میں سے چار حُجّتانِ مقرّب کہلاتے ہیں، وہ حُرُم (ادب و حرمت والے) ہیں کہ وہ روحانی جہاد سے فارغ ہو چکے ہیں، جب دُنیائے شخصی بنی، اور جب عالمِ دین پیدا ہوا، تب سے بارہ مہینوں کا یہی قانون جاری ہے، دیکھئے سورۂ توبہ ($\frac{9}{36}$) بارہ حجتوں کے علاوہ بارہ درجات بھی ہیں، جن کے اسمار اور اعدادِ حکمت درجِ ذیل ہیں:۔

عدد	اسم	عدد	اسم
۱	مستجیب	۷	حُجّتِ اعظم یا باب
۲	ماذونِ اصغر	۸	امام ؑ ؎۱
۳	ماذونِ اکبر	۹	اساس ؑ
۴	داعیٔ مکفوف	۱۰	ناطق ؐ
۵	داعیٔ مطلق	۱۰۰	نفسِ کُل
۶	حُجّتِ جزیرہ	۱۰۰۰	عقلِ کُل

؎۱ خدا تعالیٰ نے امامِ مُبین کو اپنے علم کا شہر بنا کر اس میں حدودِ دین سمیت تمام چیزوں کو محدود کر دیا ہے (۳۶/۱۲) پس نورِ امامت کی روشنی میں علمِ حدود کا مطالعہ کرنا حکمتِ قرآن کے لئے ازبس ضروری ہے، اور اس کے بغیر قرآنی تاویل ممکن ہی نہیں۔

Nasiruddin Nasir Hunzai

London 24-12-86

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

رُجوع اِلَی اللّٰہ

یقیناً ہر دانشمند انسان اِس بات کو جانتا ہے کہ رُجوع اِلَی اللّٰہ کا موضوع جتنا ضروری ہے، اتنا مشکل بھی ہے، تاہم قرآنِ کریم اور نورِ امامت کی روشنی میں ہر علمی مشکل اِن شاء اللّٰہ آسان ہو سکتی ہے، لہٰذا اسی اُمید پر ذیل کی چند مثالوں میں عاجزانہ کوشش کی جاتی ہے۔

مثال ۱: جُملہ خلائق یعنی تمام اشیاء درجات پر موجود ہیں، اور ہر درجے کی ضرورت کے مطابق ایک ہدایت مقرر ہے، اسی طرح جمادات، نباتات، حیوانات، اور انسان میں سے کوئی مخلوق ہدایتِ الٰہیہ کے بغیر نہیں، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ (۲۰: ۵۰) میں ارشاد فرمایا گیا ہے (مفہوم): موسیٰؑ نے کہا ہمارا پروردگار وہ ہے۔ جس نے عالمِ امر کی ہر چیز کو عالم خلق میں ایک مادّی صورت عطا کر دی، پھر منزلِ مقصود تک اس کی رہنمائی فرمائی، یعنی عالمِ امر میں لوٹا دیا، اس کُلیّہ سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے، کہ ہر چیز جہاں سے آئی تھی، آخر کار لوٹ کر وہاں جاتی ہے۔

مثال ۲: قیامت کے دن اوّلین و آخرین سب کے سب عالمِ شخصی میں جمع ہو جاتے ہیں (۵۶ / ۴۹-۵۰) لیکن اِس سب سے بڑے اجتماع میں بابصیرت اور بے بصیرت دو قسم کے لوگ ہوں گے (۱۷ / ۷۲ ، ۲۰ / ۱۲۴) چنانچہ اہلِ بصیرت کو اُس روز خدا کا دیدار ہوگا ، جس کی علمی اور عرفانی برکتوں سے اُن پر یہ سب سے بڑا راز منکشف ہوگا کہ وہ ازلی اور ابدی طور پر اصل سے واصل ہی ہیں ، پس رُجوع اِلَی اللّٰہ (خدا کی طرف لوٹ جانا) علمی صورت میں ہے۔

مثال ۳: سورۂ انعام (۶ / ۱۰۴) میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ: اس کو آنکھیں نہیں پا سکتیں ، اور وہ (لوگوں کی) آنکھوں کو پا سکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا کا دیدار نہیں ہوتا ، بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ جب پروردگار کا نورِ اقدس کسی کے دیدۂ دل کو چھُولیتا ہے ، تو ایسے شخص کو دیدار ہوتا ہے ، یعنی اللہ اپنی رحمت سے آدمی کی آنکھ بن جاتا ہے ، جیسے حدیثِ تقرّب کا ارشاد ہے ، جس کو آپ نے بارہا سُنا ہے ، کہ خدا اپنے عاشق کے حواسِ ظاہر و باطن کا کام خود کرنے لگتا ہے ، اور یہ رجُوع ہے۔

مثال ۴: اصل رُجوع زندگی ہی میں ہے ، جیسے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے عملاً کر کے دکھایا ، اور وہ واقعۂ معراج ہے ، جس کا ذکر قرآنِ مجید میں کئی طرح سے فرمایا گیا ہے ، معراج کا لفظی ترجمہ سیڑھی ہے اور سیڑھی درجات ، یعنی حدودِ دین کی ہُوا کرتی ہے (۳۲ / ۵ ، ۷۰ / ۴ ، ۳ / ۱۶۳) ،

جس طرح مادّی مثال میں ماضی سے حال تک اور دیہات سے شہروں تک قانونِ ترقّی کو دیکھا جائے، تو پہلے بہت ہی معمولی سیڑھیاں نظر آتی ہیں، اور اس کے بعد ایسی سیڑھیاں دکھائی دیتی ہیں، جو خود حرکت میں آکر آدمی کو اوپر تک پہنچا دیتی ہیں، جن کو لِفٹ ELEVATOR (مِصعد) یا ESCALATOR کہا جاتا ہے[1]، اسی طرح روحانیت کے ابتدائی مراحل میں شدید محنت کی ضرورت ہوتی ہے، اور پھر رفتہ رفتہ آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ خدا کی زندہ سیڑھیاں روحانی مسافروں کو اٹھانے لگتی ہیں۔

مثال ۵: سورۂ فجر کی ایک آسمانی تعلیم (۸۹: ۲۷ تا ۳۰) یہ ہے: اے اطمینان یافتہ روح! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جا تو اُس سے خوش وہ تجھ سے راضی، سو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا، اور میری بہشت میں داخل ہو جا (۸۹: ۲۷ تا ۳۰) یہاں فادخلی فی عبادی (میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا) کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے: میرے انبیاءؑ و ائمّہؑ کے عالمِ شخصی میں داخل ہو جا کہ میری جنّت یہی ہے، اور رجوع بھی یہی ہے۔

مثال ۶: اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالی تک آدمی کا جسم نہیں پہنچ

[1]: سُلَّمٌ مُتَحَرِّكٌ، ESCALATOR،

سکتا، بلکہ حقیقی علم اور نیک عمل سے وابستہ ہو کر قلب ہی وہاں تک جا سکتا ہے، جس کے لئے عملِ صالح کا ایک تخت بن جاتا ہے، اُس پر ایک پاکیزہ قول جا بیٹھتا ہے، جس میں علم و عبادت اور قلبی حقیقت موجود ہوتی ہے، اب اس چیز کو بلند ہو کر خداوند تعالیٰ کے قول و فعل سے واصل ہو جانا ہے' دیکھئے سورۂ فاطر (۳۵/۱۰)

مثال ۷ : جسمانی موت سے قبل زندہ شہیدوں کی موت مر جانا اور نور سے واصل ہو جانا رجوع ہے (۵۷/۱۲ ، ۵۷/۱۹ ، ۶۶/۸) اور یہی وہ سعادتِ عُظمیٰ ہے، جس کا ذکر قرآن کی مختلف مثالوں میں موجود ہے، جیسے سورۂ توبہ (۹/۱۱۱) میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانوں اور اموال کو اِس قیمت پر خرید لیا ہے کہ ان کو جنت دی جا رہی ہے، اب اِس حکم کے تحت جس طرح اسلام کا ظاہری جہاد واجب اور شہادت ممکن ہے، اسی طرح باطنی جہاد لازم اور روحانی شہادت ممکن ہے۔

مثال ۸ : کسی بھی مومن کو اِس حقیقت کے بارے میں کوئی شک نہیں کہ قرآنِ حکیم نہ صرف دُنیائے ظاہر میں موجود ہے، بلکہ قرآنِ مجید بحالتِ روح در روحانیت لوحِ محفوظ میں بھی ہے (۸۵/۲۱-۲۲) اسی طرح یہ کتابِ مکنون میں بھی ہے (۵۶/۷۵-۸۰) جس کو صرف وہی لوگ چھو سکتے ہیں' جو پاک کئے گئے ہیں، اب آپ قرآن ہی کی روشنی میں بتائیں کہ زمانۂ نبوّت کے مومنین کو کون پاک و پاکیزہ کرتا تھا؟ اور کس طرح؟ آپ یقیناً یہی

ISW
Institute for Spiritual Wisdom
Luminous Science

کہیں گے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم علم وحکمت سکھا کر اور دیگر ذرائع سے مومنین کو پاک کر دیتے تھے ($\frac{2}{151}$، $\frac{62}{2}$، $\frac{9}{103}$) اور آنحضرتؐ کے بعد اس انتہائی ضروری کام کو کون انجام دے سکتے ہیں؟ کیا اب کوئی نہیں ہے؟ یہ خاص کام صرف اور صرف انہی حضرات کا ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے اسی مقصد کے پیشِ نظر اپنے محبوب پیغمبر کے ساتھ ساتھ ہر طرح سے پاک و پاکیزہ کر کے رکھا ہے ($\frac{33}{33}$) اور وہ ائمۂ اہلِ بیتِ اطہارؑ ہیں جن کا نمائندۂ نورانی امامِ زمان صلوات اللہ علیہ ہیں، پس نتیجے کے طور پر جو مومنین کتابِ مکنون کو چھوتے ہیں، وہ رجوع کئے ہوئے ہیں۔

مثال ۹: رجوع دو طرح کا ہے، ایک رجوع وہ ہے۔ جو انائے عُلوی میں مرتبۂ ازل پر ہو چکا ہے، دوسرا رجوع انائے سفلی سے متعلق ہے، جس کو زندگی ہی میں انجام دینا ضروری ہے، ورنہ خوشی کا رجوع نہ ہوگا، بلکہ زبردستی کا رجوع ہوگا ($\frac{3}{83}$)

مثال ۱۰: جب سورج مشرق میں یا مغرب میں ہوتا ہے، تو اس حال میں آدمی کا سایہ دُور جا پڑتا ہے، لیکن جب آفتاب ٹھیک سر کے اوپر ہوتا ہے تو اس وقت سایہ اپنے مرکز کی طرف رجوع کر جاتا ہے، اس سے یہ حقیقت روشن ہوئی کہ نور کی قربت و نزدیکی کے بغیر انائے سفلی کا رجوع ناممکن ہے۔

مثال ۱۱: خدائے بزرگ و برتر نے لوگوں کے انا ہائے سفلی کو

پھیلادی ہے، جو نفسِ واحدہ کے اجزاء (ذرات) اور سائے ہیں، جب خدا چاہئے تو ان سایوں کو انسانِ کامل میں جمع کر دیتا ہے، پھر بڑی آسانی سے دستِ قدرت کی مُٹھی میں لیکر اپنی طرف بلند کر لیتا ہے ($\frac{۲۵}{۴۵-۴۶}$) اس اعتبار سے انسانوں کے تین مقام ہوئے، اوّل یہ کہ وہ اجسام میں پھیلے ہوئے ہیں، دُوم انسانِ کامل میں بشکلِ ذرّات اکٹھے ہیں، اور سُوم نورِ عقل میں ایک ہو گئے ہیں، پس یہ بشرطِ مشاہدہ رجوع ہے۔

مثال ۱۲: آپ قرآنِ حکیم میں بغور دیکھیں کہ رُجوع اِلَی اللّٰہ کیسا انتہائی عظیم کام ہے، اور اس کی شرطیں کتنی بڑی مشکل ہیں، مثلاً خدا کی جانب سے بندوں کی یہ آزمائش: ہر قسم کا خوف، مال و جان کا نقصان، اور پھلوں کی کمی، ان احوال اور دوسری بہت سی مصیبتوں میں صبر کرتے ہوئے خدا کو یاد کرنا، اور یہ کہنا کہ: ہم تو خدا ہی کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں ($\frac{۲}{۱۵۵-۱۵۷}$)

مثال ۱۳: خدا کے نزدیک ہر چیز کی ایک مقرّرہ مقدار ہے ($\frac{۱۳}{۸}$) چنانچہ رجوع کے لئے علم و عبادت اور نیک اعمال کی ایک خاص مقدار ہے، لہٰذا جب تک کسی مومن میں وہ مقدار مکمل نہ ہو، تو اُس بندے پر امرِ کُنْ (ہو جا) کا اطلاق نہیں ہوتا، اور اگر مذکورہ شرط کے مطابق اسے کُنْ فرمایا گیا، تو وہ شخص بقولِ قرآن امور میں سے ایک امر ہو جاتا ہے، یعنی ایسی مخلوق، جو کلمۂ کُنْ سے بطریقِ ابداع پیدا ہو جاتی ہے، اور ایسے

امور ہی خدا کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں۔ (۲/۱۱۷، ۳/۱۰۹)

مثال ۱۴: ہر کامل انسان زندگی ہی میں اس طرح رجوع ہو جاتا ہے کہ وہ جیتے جی روحانیت کی پُراسرار موت کا مکمل تجربہ کر لیتا ہے، اور کچھ مراحل کے بعد وہ مقامِ عقل پر فنا فی اللہ ہو کر اپنے آپ کو عالمِ وحدت میں پاتا ہے، جس میں خداوندِ تعالیٰ کے وہ تمام ظہورات و تجلیات ہیں، جنکا ذکر ازل، ابد، اور بہشت کے عنوانات کے تحت فرمایا گیا ہے، اس کے یہ معنی ہوئے کہ جو حضرات بحرِ رویت میں ڈوب کر فنا ہو جاتے ہیں، وہ پھر تعجب ہے کہ صورتِ رحمان یا چہرۂ خدا کے ساتھ بقا پاتے ہیں۔

مثال ۱۵: جیسا کہ حدیثِ قدسی کا ارشاد ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ ایک مخفی خزانہ تھا، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب بھی یہ خزانہ بہت پوشیدہ ہے، یعنی اس کے حجابات انتہائی مشکل مگر بیحد مفید اسرار پر مبنی ہیں، اور جو خوش بخت انسان ان عظیم بھیدوں کی معرفت حاصل کریگا تو یہ خزانہ اسی کی اور اُس جیسوں کی "انا" ہو جائیگا، کیونکہ اُس پوری حدیث کا خلاصہ اور اشارہ یہی ہے، ورنہ خدا اپنی ذاتِ پاک کو خزانے کا نام نہ دیتا، جبکہ ہر گنج اپنے لئے نہیں، بلکہ دوسروں کے فائدے کی خاطر ہوتا ہے، اور یہ حقیقت "اللہ الصمد" کی معنوی شان کے مطابق ہے کہ وہ ہر طرح سے بے نیاز ہے، پس اسکے پاس جو بھی خزائن ہیں، یا وہ بذاتِ خود جیسا خزانہ ہے، وہ سب کچھ اسکے بندوں کیلئے ہے، اور یہ رجوع کی آخری حقیقت ہے۔

Nasiruddin Nasir Hunzai
London 28-12-86

Table of Contents

علامہ نصیر الدین نصیر ہونزائی

قرآن کی باطنی تشریح سے متعلق تقریباً سو سے زائد کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ شاعر بھی ہیں۔ اپنی مادری زبان بروشسکی، جو دنیا کی ایک منفرد زبان ہے، کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہونے کی وجہ سے بابائے بروشسکی کے نام سے مشہور ہیں آپ اُردو، ترکی اور فارسی میں بھی شاعری کرتے ہیں، سینیئر یونیورسٹی امریکہ اور کینیڈا نے روحانی سائنس کے لئے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو اعزازی ڈاکٹریٹ کی سند عنایت کی ہے اور آپ اسی یونیورسٹی کے ممتاز سینیئر پروفیسر بھی ہیں، آپ کی مشہور تصانیف میں "کتاب العلاج"، "میزان الحقائق" "دُعا مغزِ عبادت"، "روح کیا ہے" اور "امام شناسی" وغیرہ شامل ہیں علاوہ ازین آپ ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے شائع شدہ جرمن بروشسکی ڈکشنری اور کیلگری یونیورسٹی سے شائع شدہ کتاب "ھونزہ پرووربز" کے ہمکار مصنف بھی ہیں۔